باب ۱۵

دُعا

خود بخود می آید ایں آواز دوست

دِل کی چاہ

دُعا غم اُمت کے دو آنسو ہیں۔ دعا فرض بھی ہے اور سُنت بھی۔ اُمّت کے لئے دعا فرض عین بھی ہے سُنت موکدہ بھی۔ اُمّت کے لئے دعا مقام معراج بھی ہے اور مقام شفاعت بھی۔ اُمتی کے لئے سب سے اونچا مقام عبدیّت کا ہے۔ دعا عبدیت کی پہچان بھی ہے اور اقرار بھی۔

چار منازِل

دعا کی چار منزلیں ہیں۔ پہلی منزل جب خلوص سے دعا کرتا ہے تو اپنے کو اہل بنا لیتا ہے مدعا کے لئے۔ یہ لطیفۂ نفس کی سطح ہے۔

دوسری منزل، یہ دل کی سطح سے ہے۔ جب دعا دل سے ہو، اپنی ذاتی یا نفس کی افادیت نہ ہو، تو ماحول کو بھی اس رنگ میں لاتا ہے کہ اس کا مدعا پورا ہو۔ دل عرش الٰہی ہے۔

تیسری منزل سالک کی دعا ہے۔ خواص کی بات ہے۔ انہیں صرف اس دعا کے لئے خیال آتا ہے جو مقدرات میں ہو۔ حق کی مرضی کو دیکھ کر ہاتھ اٹھاتا ہے۔

چوتھی منزل کن کی ہے، یہ دعا حکم ہے۔ یہ خاص الخاص کی بات ہے۔

زندگی کا اصول لیں تو چھوٹا سا کام بھی ہو وہ نیچے سے شروع کرنا ہوتا ہے۔ اسی لئے دعا میں بھی بجائے اوپر کے نیچے آؤ۔ یہاں رضا اور قضا کا سوال ہے۔ اس رضا اور قضا کی برزخ سے دعا کے وقت کیسے نکلے۔ جب اوپر سے کوئی چیز مقرر ہے، قضا ہے، تو پھر دعا کے معنی ہی کیا، فائدہ ہی کیا، حاصل ہی کیا۔ اس کے خلاف مانگا تو مقام رضا سے بھی گئے، راضی بہ رضا نہ رہ سکے۔ خیالات میں یہ دوئی اس لئے ہے کہ مرضی الٰہی کی جانب ہماری نظر نہیں۔ آخر کائنات چل رہی ہے اس کا ہمیں پتہ بھی نہیں۔ کُن کا کیف بھی نہیں، اور کائنات سے علیحدہ اپنے کو سمجھتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اللہ کہتا ہے اپنے لئے دعا کرو۔ یہ صرف آپ

کی عزت نفس کی خاطر ہے۔ ورنہ ہوتا وہی ہے جو حق کی مرضی ہے۔ اس لئے یہی کہے کہ اے اللہ مجھے مقدر پر شاکر رکھ۔

ایک مقدر اپنی باطنی صلاحیتوں کا دوسرا نام ہے۔ دوسرا مقدر جو لکھا ہوا ہے، وہ لوح محفوظ۔ اب دعا منحصر ہے اس بات پر کہ اپنے آپے کا تخیل آپ کے ذہن میں کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں انسان کا بھید میں ہوں، اور وہ میرا بھید ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ میں اپنے بندے کے گمان پر منحصر ہوں۔ تو اپنا آپا کو اگر جسم سمجھا تو نفس کے خلاف جو بات ہوئی اس سے گھبرائے، تلملاتے، غمزدہ ہوئے۔ کیونکہ نفس کی بنیادی صفت ہے خوف، نامیدی، ایسی ظلمت اور نا اُمیدی میں دعا کیا۔ نفس ہے تو یہ خوف کسی طرح ختم کیا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ لاعلاج بیماری ہے۔ اس کی جڑیں کروڑوں سال گہری ہیں۔

عشق تقدیر پر غالب ہے

البتہ اس نفس کو رخ دیا جاسکتا ہے۔ محبت سے بدلا جاسکتا ہے۔ عاشق بے باک نڈر ہوتا ہے، نہ صرف محبوب سے راضی بہ رضا بلکہ اپنا سب کچھ محبوب پر قربان کر دینے کی فکر میں ہوتا ہے۔ عشق تقدیر پر بھی غالب ہے۔ عاشق سے نہ پردہ ہے نہ حجاب اور تقدیر اس کی جیسے گھر کے باہر سے جھانکے۔ جب محبت بے وجہ ہو، خود بخود ہو تب محبت ہے۔ محبت شکر کا جذبہ لئے ہوتی ہے، قربان ہونا جانتی ہے۔ اسی لئے رحمت کو جذب کرتی ہے۔ اپنی ظلمتیں گھیرے رہیں تو رحمت سے محروم ہوا۔ اپنی احسان کو نہ دیکھا کہ جس نے رحمت اور احسان کو قبول کرلیا وہ خوش نصیب ہے۔ رجوع الی الحق ہے۔

انسانی وجود

انسان اپنے وجود پر غور کرے۔ تقدیر اور تدبیر کی استعداد یا صلاحیت خود اس کے اندر موجود ہے۔ تقدیر اور تدبیر کو ہم جدا نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ خیال ضرور گذرتا ہے کہ آخر ہم اس کے لئے کیوں کوشش کرتے ہیں جو مقدر میں نہیں ہے اور ناکام رہ کر اپنی ظلمتوں میں اور گرفتار ہو جاتے ہیں تو ایسی بات ہے جیسے غیر شادی شدہ عورت بے ثمر۔ جب حق سے تعلق ہی نہیں تو اپنی ہر بات کو حق سے لاتعلق دیکھے گا۔ یا حق کی ہر مرضی کو اپنے سے لاتعلق۔ ایسے کی دعائیں اپنی مایوسی کی وجہ سے قبول نہیں ہوتیں۔ اپنی ناعاقبت بینی سے وہ مرضی حق دیکھنے سے ناکام رہتا ہے۔ ایسے کی دعا سوائے اس اعلان کے کیا ہے کہ میری یہ خواہش ہے، مجھے یہ چاہیے، میں اس طرح سے خوش ہونگا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی روح کی تڑپ، پکار کیا ہے قلب کی دنیا سے وہ بے بہرہ ہے۔ محبت اگر اس نے بنا رکھا ہے تو وہی اپنی خواہشاتِ نفس و جسم کو۔ اپنے احوال، اپنے اہل و عیال اور اپنی انفرادی زندگی

کی ظلمتوں میں وہ ایسا گھرا ہے کہ نظر اس سے اوپر نہ عبادت میں اٹھتی ہے نہ دعا میں۔ نہ زندگی کی تگ و دو میں، نہ موانست و مجالست میں۔ گویا وہ ایک ہاتھ سے ہی تالی بجانے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ وہ دوسرا ہاتھ، حق کا ہاتھ، مقدر کا ہاتھ، اسے نصیب یوں نہیں کہ اس دنیا میں اس نے قدم ہی نہیں رکھا جہاں سے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ وہ قلب کی دنیا، تو ہی تو۔ اور جہاں سب کچھ ، زندگی کا ہر پہلو، ہر قدم، ہر خواہش، ہر تمنا تیرے لئے۔ محبوب کے لئے ہوتی ہے۔

دعا کے معنی ہیں بلایا، مدد مانگی۔ یوں عام بلانے یا پکارنے میں نام شامل ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی۔ مگر دعا کے ساتھ اسم ہوتا ہے۔ جیسے یا شیخ، یا اللہ۔ یوں قرآن کی جتنی دعائیں ہیں، جمع کے صیغے میں ہیں، جیسے یا اللہ ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔ 'ہم' کہتے ہی انفرادیت ختم ہوئی۔ صرف اپنے لئے یا اپنے نفس کی خواہشوں کے لے لئے دعا کرنا نہ ہوا۔ اسی لئے دعا کی سطح کچھ ایسی ہوئی جیسے دعادی، دوسروں کو دعادی۔ اس کی مخلوق، ان کی اُمّت، کے گموں میں شریک ہوئے۔ اللہ اور رسولؐ کے ساتھ اپنی مرضی کو شامل کرلیا۔ انہیں اپنی مخلوق اور اُمّت سے جو لگاؤ رحمت کا تھا اس رحمت میں خود بھی آئے۔ اب کہیں "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم" کی مخلوق اور رحمت اللعالمین کی اُمّت میں ہوئے، دعا کرنے کے مصداق بنے۔

خلوص، دعا کی پہلی منزل

یہ خلوص ہی کی پہلی منزل ہے۔ اس سے نچلی سطح پر دعا کے کوئی معنی ہی نہیں۔ یہ پہلی منزل وہی ہے جب خلوص سے دعا کرتا ہے تو اپنے کو اہل بنالیتا ہے مدعا کے لئے۔ صرف دوسروں کے لئے دعا ہی نفس سے اوپر کی سطح سے ہوسکتی ہے۔ اور یہ جو ہم روتے ہیں بچے کے لئے ٹھیک ہو جائے تو وہ ہم نفس کی سطح سے دعا کر رہے ہوتے ہیں، اپنا جو لگا ہوتا ہے، اس لئے قبول نہیں ہوتی۔ یوں وہ "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم" ہے۔ اس کا کلام رحمانیت سے پر ہے۔ آیہ کریمہ پڑھ لیں یا کوئی اور آیتیں، تو اس کی رحمت سے اثر ہوتا ہے۔ البتہ ہم جو سمجھتے ہیں کہ آیہ کریمہ سے شفا ہوئی یہ بھی عجب نادانی ہے، پردہ ہے۔ ہم اس رحمت کو بھول جاتے ہیں جو رحمت محمدیؐ کی شکل میں ہے۔ "وَرَحْمَتِیْ وَسِعَ" یہ کرم، فیض، رحمت، سب نور محمدیؐ سے ہے۔ آیات، نشانیاں ہیں اس رابطہ کی جو عبد اور معبود کے درمیان ہے۔ جاننا ہو جاتا ہے دیکھنا ہو جانا ہے۔ پڑھنا ہو جانا ہے۔ جب اس کی طرف رخ ہی نہ ہو تو انعامات کیوں ملیں، تمھاری کیوں سنے، جب اس کے نہ ہو سکے تو نہ ٹوٹنا جانو گے، نہ انعامات پر مشکور ہوسکو گے، نہ اپنی ناامیدیوں، ناکامیوں، سختیوں میں یہ دیکھ کر لطف اندوز ہوسکو گے کہ وہ تمھیں کس طرح کھینچ رہا ہے۔

پھر جب اس کو اپنی جانب انعامات اور ابتلاء دونوں میں متوجہ دیکھو گے تو اپنے لئے دعا کیا کرو گے۔ اسے کیا سمجھاؤ

گے کہ یہ کرنا وہ نہ کرنا۔ کیا وہ ناسمجھ ہے۔ سمجھداری کی بات تو یہ ہے کہ اپنے لئے اس سے یہی کہو کہ وہی اچھا ہے جو تجھے منظور ہے۔ اپنا اور اس کا تعلق تو عبد اور معبود کا ہے۔ عبادت لگن کا نام ہے۔ تعلق کے اقرار اور تازگی کی صورت ہے۔ اس انداز کی دعا بہترین عبادت ہے۔ دعا کیا مانگو۔ بے مانگے بہت دیتا ہے۔ فرمان ہے جو میرے ذکر کی کثرت میں دعا نہیں کرتا میں اسے زیادہ دیتا ہوں۔ اس طرح اپنی زندگی اور طلب اور عمل میں سے جب ظلمتیں نکل گئیں تو خواہ مخواہ نور نکلتا ہے۔ یوں بھی قدوس کے لئے پکار تو پاک ہونی چاہیے۔ قدوسیت اور معصومیت لئے ہونی چاہیے۔ یہ ایسی دوا ہے اور ایسی یاد ہوتی ہے کہ مشکل وقت تک میں مرحبا ہی منہ سے نکلتا ہے۔ جیسے قصیدہ بردہ شریف جو جزام کی بیماری میں لکھی گئی، نعت رسولؐ ہے۔ نہ اپنی ابتلاء کا ذکر ہے، نہ اپنی بیماری سے نجات کی طلب ۔

یوں بڑے بڑے زہد و تقویٰ والے اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے بڑے خلوص اور سچائی سے روتے رہتے ہیں۔ نظر غائر سے دیکھا جائے تو یہ بھی خودفریبی کا ایک روپ ہے۔ کو یار کے آگے ہی رو رہے ہوتے ہیں۔ مگر طلب تو اپنی ہی ہوتی ہے۔ اس لئے پچھلے کو یاد کیا کرنا۔ زندگی کی بات تو آگے دیکھنا ہے۔ یار کو ہی یاد کر لو۔ توبہ تک میں اپنی یاد ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ خود پرستی ہی ہوئی، خدا پرستی اسے کیسے کہہ سکتے ہیں۔ تو پھر کیا دعا کی ہی نہ جائے۔ ہرگز نہیں۔ یہ ایک قسم کی ناسمجھی کی بات ہے۔ مانا کہ سُنت الٰہی سُنت الٰہی مقرر ہے۔ تقدیر مقرر ہے، لوح محفوظ کی تحریر اٹل ہے۔ مگر اللہ کی ربوبیت کوئی ساکن چیز تو نہیں۔ اللہ تو اللہ، سورج تک سب کو نوازتا ہے۔ جو بھی اس ربوبیت کے ساتھ مصروف عمل ہو وہ اس ربوبیت کے نشر کا ذریعہ بنتا ہے۔ جس رخ کہ کائنات چل رہی ہے، جو مشیت اور مرضی الٰہی ہے، اس کیفیت کے ساتھ انسان دم ساز ہو جائے تو تقدیر ساز گار ہوتی ہے۔ تقدیر، تدبیر، ہم آہنگ ہوتی ہے۔

یوں دعا یا زندگی کا کوئی عمل ہو، بات بس خلوص اور لگاؤ کی ہے، قلب و محبت کی سطح کی ہے، حیات انسانی سے دو پر کی سطح کی ہے، حیات انسانی کی حقیقت کی راہ میں پہلے قدم کی ہے۔ اسی کے لئے ساری ہدایات اور صحیفے اترے۔ انبیاء اور اولیاء بھیجے گئے، پیرویان اسی سطح سے دعا مانگنے کے حقدار ہوئے۔ انہوں نے خدا کی طلب اور پہچان مانگی۔ رشتہ عبد و معبود قائم ہوا۔ اور ادھر سے محبت کی تڑپ میں ارشاد ہوا کہ مجھ سے مانگو میں تم کو دوں گا۔ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ مگر عاشق مانگے بھی تو کیا۔ اپنے لئے مانگ کر بھی اپنے عشق کی بے حرمتی کیسے کرے۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

ناز پروروں کی دعا

اسی لئے دعا کارخ ہوا کہ تجھ سے مانگا ، تیری خوشنودی کے لئے، تیری مخلوق، تیرے محبوبؐ کی اُمت کے لئے۔کبھی تیری مرضی کو دیکھ کر مانگا، جیسے حضرت عمرؓ اور ابو جہل کے درمیان دعا اور کبھی محبت کی شوخی میں، وہ انداز کہ میرے تیرے میں فرق نہ رہا،تو جو تیری مرضی وہ میرے مرضی، اور جو میری مرضی وہ تیری مرضی۔

"اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالطَّیِّبَاتُ"

یہ ناز میں پرورش پانے کی بات ہے۔یار کی اداؤں کو اپنا کر زندگی گذارنے کا صلہ ہے۔ یوں عبادتوں ریاضتوں میں لاکھ جان ماریں، ماننا نہ ماننا تو ادھر سے ہے۔عبادت الگ چیز ہے، اور معبود ملنے کی بات دوسری ہے۔ یہ بات تو دامن کی ہے۔ قرب اور روشنی تو بس دامن رحمت میں ملتی ہے۔

ایک بزرگ نے وصال سے پہلے عجب بات بتائی جس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ بزرگ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک فقیری کی زندگی گذار چکے تھے۔ نہ صرف یہ کہ عالم دین وشریعت، پابند صوم صلوٰۃ، ہر دم مشاغل و ذاکر تھے، بلکہ آمرین وقت میں سے اور مقامِ روح، انتقال روح، وسیر فی الارض والے، زمانہ کے لئے رشد وہدایت کا سرچشمہ،تزکیہ باطن و تسکین قلوب کے لئے مرجع خلائق، قادریہ،نقشبندیہ، چشتیہ سلسلوں میں ایک اعلیٰ مقام اور دسترس رکھنے والے۔ انہوں نے مجھے تنہائی کراکے اپنے پاس بلایا اور بتایا کہ میں کئی دن سے سخت بیمار تھا۔میرا ایک مرید دور دراز سے چلا اور مجھ تک پہنچا۔اس نے عرض کی چار پانچ دن کا راستہ طے کرکے آیا ہوں۔ وجہ یہ کہ جو روحانی تعلق میرے اور آپ کے درمیان تھا وہ مفقود ہوا تو مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ شاید آپ انتقال کرگئے۔اسی لئے آیا ہوں۔ان بزرگ نے مجھ سے حسرت سے کہا، جس کے پیچھے برسوں کی ریاضتیں اور مجاہدے تھے، کہ اس مرید نے مجھے عجب سبق دیا۔اب مجھے معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد سارے لطائف ختم ہو جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس حسرت و یاس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے۔جس نے اپنا خون پسینہ طریقت کی راہ میں صرف کیا ہو۔ یہ بزرگ اب انتقال فرما چکے ہیں۔ان کا سارا سرمایہ اگر عبرت نگاہ سے دیکھا جائے تو سوائے ان فیوض اور برکات کے اور کیا ہو سکتا ہے، جسے رحمت اللعالمینی ہی کہا جاسکتا ہے۔حق یہی ہے کہ دامن رحمتؐ اللعالمینی ہی سب کچھ ہے۔اور یہ انہیں نصیب تھا۔جیسے ہی میں نے یہ توجہ دلائی ان کا چہرہ روشن ہوگیا۔

انسان کیا، اس کی بساط کیا، اس کے مجاہدے کیا، اس کی ریاضتیں کیا۔موت کے بعد جو چیز قائم رہتی ہے، اس تک

رسائی نہ ہوتو جینا بے کار ہے، مرنا بے کار ہے۔ ہر چیز اپنے مجاہدے، بچّے وغیرہ سب قبر تک ختم۔ زندگی میں البتہ محبت و رحمت کی اقدار جو دائم قائم ہیں وہ مرنے کے بعد بھی رہیں گے۔ یہ اسی وقت کر سکتے ہیں جب آپ کی نگہ ادھر سے ہو، اس چار دن کی زندگی سے نہیں۔

ایک ہاتھ میرا، ایک ہاتھ تیرا

ہم دعا کرتے ہیں، کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ غوث پاکؒ نے فرمایا، دعا تو حکم ہوتا ہے۔ ادباً اسے دعا کہہ دیتے ہیں۔ یہ جیتے جی وصال ہو جانے سے پہلے نصیب نہیں ہوتا۔ ایک ہاتھ میرا، ایک تیرا۔ ایک قدم میرا، ایک تیرا،

ے ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکان کو ایک نقشِ پا پایا

یہ وہی جانتا ہے جو عمر بھر جھاڑ جھونک کر ایک پیر میں آ کر اٹک جائے۔ دوسرا نقش پا جو ہوا۔ یہ کتنے رمز کی بات ہے۔ دیکھتے آئے ہیں کہ پاک طینت، پاک خون لوگوں نے عمریں گذار دیں، علم کی جستجو میں، حقیقت کی پیاس میں۔ ان کے اعمال میں ولولہ بھی تھا اور خودشناسی کی جدوجہد بھی۔ مگر بالآخر جب دیکھا کہ بس کچھ دن اور باقی ہیں اور روشنی نہیں ملتی تو فقراء کی طرف رجوع ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ سارے دشتِ امکان کو انہوں نے طے کیا اور نقشِ پا کو ہمیشہ نظر میں رکھا، خلوص، اور محبت کے ساتھ، مگر بالآخر انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک ہی نقشِ پا تھا، دوسرے کا پتہ نہیں۔ اس دوسرے نقش پا کا پتہ تو کیا دینا تھا۔ مگر حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کو یہ ضرور بتایا تھا کہ ایک نقشِ پا اور بھی ہے۔ جس کا انکشاف علم لُدنی سے ہے۔

ہم اس ذاتِ پاک کے طالب ہونے کی وجہ سے یوں خوش نصیب ہیں کہ اس دوسرے نقشِ پا کا بطون قرآن میں، مغزِ قرآن میں بین موجود ہے۔ یہ صراطِ مستقیم شمسِ حقیقت کی روشنی میں راستہ چلنے کے لئے ہوتا ہے۔ اپنے انجام یا انفرادیت وخود غرضی تک پہنچنے کے لئے نہیں۔ نہ ہی صرف حقیقت سمجھنے اور دیکھنے کے لئے۔ ایک محاورہ ہے کہ موڑ سے پرے کیا ہے، تب ہی پتا چلتا ہے جب موڑ تک پہنچ جائیں۔ یہ بھی مالک کی شان ہے کہ انسان کو قیام عطا فرمایا اور دو پیر دئے، چلنے کے لئے اڑنے کے لیے پر نہیں دیے۔ ایسا ہوتا تو قیام نہ ملتا۔ جب دوسرا نقش پا مل گیا تو گو بظاہر دو نقش ہیں مگر ایک واحد کے اور وہ ساکت نہیں، محرک ہیں، رواں دواں ہیں فقراء کا کہنا ہے کہ یہ دوسرا نقشِ پا، انفاس یعنی باطن کی دنیا میں رکھا جاتا ہے۔ محض انفاس کی

دنیا میں گم ہوئے، سبحان اللہ کہا اور مجذوب ہوئے۔ آفاق کی سیر کی، الحمد اللہ پکار اٹھے، زینت کائنات بنے۔ اور جو انفس و آفاق کو توازن میں لئے، اپنے مقصود، شمس حقیقت کی روشنی میں رواں دواں چلتے ہی گئے، وہ حقیقتاً پھیلتے ہی گئے۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ انسان کی ساری بے کلی اور بے چینی کی وجہ یہ ہے کہ روح جو آزاد ہے، اس جسم کی قید سے نالاں ہے، تو اس بے کلی کو تب قرار آئے جب پھیلتے پھیلتے اس شمس کی روشنی میں اتنا پھیلے کہ جزو کل کا احساس بھی جاتا رہے۔ روح کی آزادی کا سرور کچھ ایسی زندہ اور محرک کیفیت ہے جو ایک لرزتے ہوئے شعلہ میں ہوتی ہے۔

یہ دوسرا پیر، دشتِ امکاں سے ماوراء ہے۔ یہ جو پیر ہے، کُن فیکون کی بانگ دُہل ہے۔ جیسے ایک فوج ڈھول کی تھاپ پر چلتی ہے، صحیح ڈھول بجتا رہے تو فوج کے قدم خود بخود ٹھیک پڑتے ہیں اور اگر ساتھ ساتھ بیگ پائپ ہو تو پھر ایک نشہ۔ ڈھول کی تھاپ تو ہوش کی بات ہے مگر بیگ پائپ ایک نشہ کی مستی۔ اور یہ شہنائی، کی سریلی آواز عشق کی الاپ ہوتی ہے۔ اس طرح ایک ''کُن'' دوسرا ''فیکون''۔ زندگی کے صحرا میں ان دو پیروں سے بھاگتے ہیں۔ بغیر ''کُن'' کے اپنے اندر ہونے کے نہ کائنات وجود سے ہم آہنگی ہو سکتی ہے، نہ خالق کائنات سے۔ ایک عاجز، عاشق ہی اس رابطے کے دائمی تشکر میں ہوتا ہے۔ اس کے لئے دعا کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔

توبہ کا دروازہ مانا کہ آخر وقت میں بند ہو جاتا ہے مگر دعا تو سراپا رشتہ رحمت ہے۔ آخر وقت تو یہ رشتہ اور مضبوط ہو جانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ نازک سے نازک وقت میں تو اور قربت نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے دعا کا دروازہ بند ہونے کے صرف یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ ہزار کوشش کے باوجود قلب ادھر رجوع نہیں ہوتا۔ مگر طلب میں شدت ہے تو کسی طرح ہار نہیں مان سکتا۔ کسی نہ کسی چور دروازے سے ضرور پہنچنا چاہے گا۔ کسی حالت میں ہار نہ مانے گا۔ یہ طلب صادق کی بات ہے جو باطن کی گہرائیوں میں نصیب ہوتی ہے۔ یہ ضد کی بات نہیں۔ طلب صادق میں عجز اور شکر ہوتا ہے، اور بلا کی تشنگی، اس لئے رحمت ضرور آتی ہے۔

دعا کے طریقے

اس رحمت کو اپناتے ہوئے دعا کے دو ہی طریقے ہیں جن سے قبول ہوتی ہے۔ ایک عجز، ایک حکم۔ یہ عاشق اور عارف کے مقام سے ہے۔ عاشق کی دعا کیا ہوتی ہے۔ بابا قادرؒ سے ایک دفعہ پوچھا دعا کیا ہوتی ہے تو فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اور نبی کریمؐ نے جو طریقے بتائے ہیں وہ حق ہیں۔ البتہ اکثر اچھے اچھے رنجیدہ خاطر ہوتے ہیں کہ آخر دعا قبول کیوں نہیں ہوتی۔ دعا کے قبول نہ ہونے کے متعلق بہت سے اقوال ہیں۔ مگر اس دل آشفتہ کی تسلی نہیں ہوئی۔ بابا جانؒ نے پوچھا کیا تم نے کبھی کوئی اینٹوں کا بھٹہ

دیکھا ہے، جب وہ پورے تاؤ پر ہوتو کھڑکی کھول کر اندر بھی جھانکا ہے۔ جب میں نے ہاں کہا تو فرمایا کیا دیکھا۔ میں نے عرض کیا آگ ہی آگ۔ پوچھا، اس وقت اینٹ اور آگ میں کوئی اُمتیاز کرسکتا ہے۔عرض کیا نہیں۔تو پھر ارشاد ہوا کہ اس حال میں جو اینٹ کی زبان سے نکلنے وہی کُن ہے۔اور دعا اور قبولیت میں کوئی فصل نہیں رہ جاتا۔پھر عرض کیا کہ حضور اس حال میں کوئی چیز کوئی کیا یاد رکھے۔تو ارشاد ہوتا ہے کہ ''فَاذْکُرُونِیْ اَذْکُرْکُمْ'' کوئی فرد یا جمعیت اگر اس بھٹی والے کی طرف رجوع ہوتو خواہ مخواہ اینٹ کے وجود سے بھی وہی دعا نکلتی ہے۔ یہ عاشق کی دعا۔ عاشق ارض پر قیام کئے ہوتا ہے۔اور عارف سمٰوات اپنی لطافتوں یا آسمانوں کو،تو عارف کا قیام کم ازکم جبروت میں ہوتا ہے۔اورطریقت کے کاملین، ملکوت میں ہوتے ہیں۔اہل ملکوت تو صرف اس امر کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں جو لکھ چکا ہو۔ قبولیت تو حاصل ہے ہی۔اتنی بات ضرور ہے کہ یہ نزول سہل ہو جاتا ہے۔

عارِف کی دُعا

عارِف کی دُعا یہ ہے کہ سمٰوات سے جب عاجزی اورعبودیت کی امانت کا بوجھ اٹھالیتا ہے تو ایک شاہین طرح اپنے پروں کو سمیٹ کر، تیر کی طرح، زمین پر اترتا ہے۔اس طرح وہ حقیقت کے سمندر میں گرتا ہے۔سمندر کی ساکت اور قائم سطح میں جو موجیں اٹھتیں ہیں ان میں ''کُن'' کا ارتعاش ہوتا ہے۔ بحرحقیقت کل کی احدّیت ہی تو ہے۔اس عالم جبروت میں عشق کی آگ نہیں ہوتی۔عشق کا غم نہیں ہوتا۔ یہ وہی غم ہے جو نبی کرمؐ کو اُمّت کے لئے تھا، یہی غم، عارف کو عجز کا سرمایہ عطا کرتا ہے اور اسی عجز کے سہارے اس کا ارض کی سمت نزول ہوتا ہے۔عجز انتہائے انسانیت ہے، بہت مشکل ہے۔اس عجز میں دعا کے لئے جو ہاتھ اٹھاتے ہیں وہ بھی عمل ہے۔خلوص سے دعا کے لئے ہاتھ اسی وقت اٹھتے ہیں جب کوشش بھی ہو رہی ہو، خواہ لاشعوری طور سے ہی سہی مگر عمل کرتا رہے گا کیونکہ دراصل جب مقدرات میں ہے اسی کے لئے ہاتھ اٹھتا ہے، یا اس کے الٹ، کہ خلوص سے ہاتھ اٹھائے،تو مقدر بن گیا۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔خلوص، اللہ کی ان نعمتوں میں سے ہے جو ان بندوں کو دیتا ہے جن سے اسے محبت ہے۔خلوص میں سارے خول جھڑ جاتے ہیں۔ جیسے اانسان بیماری کی انتہائی تکلیف میں ہوتو سب جھڑ جاتا ہے۔ایسے ہی خلوص میں ایک ہو کر رہ جاتا ہے۔ظاہر باطن سے جھڑ جاتے ہیں۔ جب ایک رہا تو اس کا کہنا اٹل ہے۔ یہ خلوص کی دعا کا مقام ہے۔''اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ'' پر مقام ہے، اصلی انعام ہے۔اگر لگن ہے، عقل و دل ایک ہی بات کہتے ہوں، دھن ہو، صداقت ہو اور شدت کے ساتھ ہو، تو قبول ہوگی۔ ورنہ جو چیز اپنے اندر نہیں ہے وہ اثر ہی نہیں کرتی۔ بے دلی

سے ہاتھ اٹھتے ہیں حالانکہ دعا سے بہتر عبودیت کا اظہار کوئی نہیں ہوسکتا۔اور کہا گیا ہے کہ عبودیت پر پہنچنا ہوتو دعا مانگو۔ ہر چیز کے لئے مانگو، ہر وقت مانگو، کیونکہ دعا جو اپنی تکلیف اور آرزو کے لئے کرتے ہو اس تک سے وہ ڈورا بندھ سکتا ہے جو رحمت کے رشتے میں پرودے۔اس سے بہتر عبادت اور کیا ہوسکتی ہے۔

پتہ پتہ حکم کا تابع

یوں پتہ پتہ اس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرسکتا۔ پتہ پتہ اپنی اپنی سطح پر اس کا امر لئے ہے۔اپنے ہی اندر یہ امر ہے اور قدرت کے اصولوں کے تحت ہے، بے لگام نہیں۔ جائزہ لے تو ہر کام انسان خود نہیں کر رہا، بلکہ اس سے کروایا جارہا ہے جب تک قویٰ میں جان ہے، جسم و اعضا سازگاری کرتے ہیں، عمل کرتا ہے۔ جیسے جب قوت حیات میں کمی ہوئی تو خود بھی کرنا چاہے تب بھی مجبور ہے۔ یہی حال کچھ دعا کا ہے اس کے لئے اپنے ہی اندر محرک قوت ہے، خلوص ہے۔انسان بغیر خیال کے حرکت نہیں کرسکتا۔خیال ہی اس سطح پر محرک قوت ہے اور محبت کی دنیا میں بغیر عشق کے جذبے کے شدت عمل نہیں آتی۔اس حالت میں عشق ہی حکم ہے، شدت عمل کے لئے۔اور حکم دل کی چاہ ہے سوا کچھ نہیں۔اس میں سراپا خلوص ہے، صداقت ہے، محبوب سے یکتائی ہے۔

اس سے ایک منزل اوپر بغیر روح کے تصرّف کے انسان عروج عمل نہیں کرسکتا۔اس حالت میں روح، حکم ربی ہے، جدھر خیال چلا ادھر چلی لیلیٰ (روح)۔خیال اور مرضی الٰہی سازگار ہیں۔ روح اس جانب رواں دواں ہے، روح ہے ہی سراپا حکم، اسی کے تصرف میں جان، عشق، خیال، قوّت، وغیرہ ہیں۔ یہ جو لوح محفوظ کی تحریر ہے یہ وہی تو ہے جس کے تحت امر روح و جان وقلب و خیال ودیعت ہوا ہے۔اسی لئے اس سطح سے جب دعا ہوتی ہے تو کُن کی سطح سے ہوتی ہے۔ زبان بندے کی اور حکم اسی کا۔ یہ اسی کے امر سے ہے جو مجھے ملا ہے، میرے اندر پھونکا ہے۔میرے (Genes)جینز میں ہے، لوحِ محفوظ میں ہے، یہی روح میری جان کی جان ہے۔اور یہ وہ قوت ہے جس سے جان نے وجود لیا۔اور اب جان کے ذریعہ جسم کی حرکت ہے۔ خیال، خواہشات، جذبات قلبی اور وجدانی کیفیات، عشق وغیرہ، اسی کے وسیلے سے ہیں۔

یہ تو رہا فرد کی حد تک، اب فرد اور ماحول کے عمل اور ردعمل میں یہ حکم الٰہی کس طرح دیکھا جائے۔مثلاً کسی کو خزانہ مل گیا، کسی کو بلاوجہ کسی نے مار دیا، یا کتے نے کاٹ لیا، ایک طوفان یا سیلاب نے تباہی مچا دی۔تو بات یہ ہے کہ میں نہ اپنی مرضی سے پیدا ہوا نہ اپنے خیال کے مطابق بنا، نہ اپنے ارادہ سے زندگی پر متصرف رہا۔ یہ تصرف سب اسی کا ہے جس کا حکم چل رہا

ہے۔ایک چھپا خزانہ حکم لئے ہے پہچانے جانے کا، ایک گھرا ہوا مجبور انسان مجبور ہے، سختی اٹھانے پر۔ایک سیلاب، ایک طوفان ایک وبا مجبور ہے تباہی کرنے پر، سورج حکم لئے ہے، روشنی اور حیات بخشنے پر۔ابر رحمت حکم لئے ہے حیات ونموعطا کرنے پر۔ ایک صاحب امر، حکم لئے ہے مرضی چلانے پر، کوئی غیر تو نہیں۔آخر کو صاحب تصرف ہے خلیفۃ اللہ ہے، کائنات میں مرضی حق کو چلانے کا یہی وسیلہ ہے، قوانین فطرت۔مرضی الٰہی کے ساتھ ایک ہی اکائی میں ہے۔

یوں عام انسان کے لئے یہی ہے کہ جو ہوتا ہے ہونے دو۔پتہ پتہ اس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا۔حرکت میں ہی حکم ''کُن'' چل رہا ہے۔ایک توازن ارتقاء میں کائنات چل رہی ہے۔ایک قطرہ، سمندر کا توازن کیسے برباد کرسکتا ہے یا سمندر کو اپنے توازن پر کیسے لاسکتا ہے۔میری حیات، الحیات ایک توازن میں ہیں تو مثبت، منفی سب ایک ہی توازن میں ہیں۔کیف میں آؤ تو وہی ایک، ہوش کی دنیا میں رہو تو دوئی۔ایسا کیوں ویسا کیوں۔اس وہم دوئی سے نکلنے کے لئے غوث پاکؒ نے فرمایا پہلے خلق سے مرجاؤ، پھر نفس سے، پھر اپنے ارادے سے، جب یہ ہوا تو حق کا ارادہ، امر ربی ہی ایسے میں کارفرما ہوگا جب تک کثافت وجود میں موجود ہے، دنیا میں پھنسا ہے، اپنی نفس کی خواہشات اور طلب میں پھنسا ہے تو راہ کیسے ملے۔الطف در الطف کا عرفان کیسے ہو۔

حق کی حقیقت سے ہر انسان اپنے اندر ہی روشناس ہوسکتا ہے۔ ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ'' یوں سادہ آدمی اللہ کو ایک شخصیت مانتا ہے۔اللہ تک کو تفرید میں اتار کے ایک روپ دے دیتا ہے۔یہ ضروری تھا حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک۔حضرت عیسیٰؑ نے تجرید کی طرف رخ دلایا۔اسی لئے قلندر اوّل کہلائے۔اور اسلام کی توحید کا تو یہ انداز ہوا کہ کثرت میں وحدت، وحدت میں کثرت۔اگر ہم کائنات وجود کو ایک سمندر مان لیں اور اپنے کو موج، اب اس موج میں سے لہر کا شعور ہٹا دیں تو کہے گا سمندر ہے۔انگلی جس جگہ رکھ کر کہے گا کہ سمندر ہے تو وہی سمندر ہے۔سارے سمندر پر انگلی کیسے جائے۔وہ اس حالت میں یہی کہہ سکتا ہے کل ہے۔یہ نہیں کہے گا کہ میں اس کا جزو ہوں۔

یوں سادہ آدمی کا عقیدہ بھی مبارک ہے۔اس کی دعا بھی قبول ہوتی ہے۔مصیبت پڑتی ہے تو ان لوگوں کی، جو سوچتے ہیں کہ تو کہاں ہے۔جنہوں نے سائنس پڑھی وہ تو یہی کہیں گے کہ کہاں ہے ساتویں آسمان پر خُدا۔ان کے لئے خلاء اور وقت کا سوال ختم ہو جاتا ہے۔مکان ختم ہوا تو زمان بھی ختم ہوا۔ادھر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اَنَا دَھْر، تو بات یہ ہے کہ یہ لوگ حق کی تجرید کو بھول جاتے ہیں۔یہ سادہ لوح تو نہیں کہ یہ بھی نہ دیکھ سکیں کہ مجردات کی شکل میں حقیقت کہاں ہے۔ ''وُسِعُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ'' نظر لطافت سے طاقتوں اور مجردات میں دیکھیں تو ہر شے کا باطن الطف در الطف صورت میں وہی حق ہے۔جب

باطن در باطن کو حق مان لیں، ''هُوَ الظَّاهِرُ هُوَ الْبَاطِنُ'' تو وہی مرکز تخلیق ہے۔ کسی فرد یا شے کی انفرادیت یا تفرید، دراصل اسی حق کی تجرید یا مجردات کا نقطہ ہے۔

دردِ اُمّت

جب مادیات سے نظر ہٹے، حقیقتوں میں زندگی گزرنے لگے، تفرید میں بھی حق کی تجرید نظر آنے لگے، تب ہی حق شناسی کا مصداق بن سکتا ہے۔ جب تک خلق، نفس اور ارادے سے نہ مر جائے آلائشوں سے کیسے چھوٹ سکتا ہے۔ جب لذتیں دنیا کی پھیکی پڑ جائیں تب ملتی ہے روح۔ جب انعام کے طور پر ملے تو وہ ہے مسلمان کی روح۔ دین اور دنیا بھی وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ملے۔ جب تک دنیا سے قطعی بے تعلق نہ ہو، انعام کبھی نہیں ملتا۔ کلمہ بھی ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' یقین نہیں تو ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کیوں کہا۔ جو کچھ بات بنتی ہے وہ حضورؐ کے تعلق سے ہے۔ لہٰذا سب سے بڑی دعا اور سُنت اُمّت کا درد ہے۔ یہ لگن لگتی ہے نسبت محمدیؐ سے، باطن اُمّت کا شعور ایک نصب العین کے لئے جینا اور مرنا ہے۔ اُمّت میں انتشار ہو تو اقبال مندی جاتی رہتی ہے۔ اُمّت کے اس معاملہ میں ایک دل کی، روح، آرزو و تمنا ہوتی ہے۔ وہ تو شاید سب میں ہے۔ اُمّت کے لئے دعا کرنے کا مصداق ہو۔ اس صحیح دعا کا تعلق تعداد سے اتنا نہیں جتنا کہ مرکزیت سے لگاؤ سے ہے۔ رابطہ اور وسیلہ محمدیؐ سے ہے، جس کا تعلق اپنے قلب و روح کی گہرائیوں میں باطن سے ہے۔ باطن سے ظاہر بنتا ہے۔ اس بات پر پابند رہے تو بات بن جائے گی۔

کربلا کے موقع پر حضرت امام زین العابدینؑ کی دعا نہ اپنی حالت زار کی فریاد تھی، نہ اعانت کے لئے پکار تھی۔ **رحمۃ للعالمینی** نسبت نے اس وقت بھی گوارا نہ کیا کہ قوم دین و دنیا میں اپنے اعمال اور **شفیق القلبی** کی گرفت میں آئے۔ یہ دعا قوم کی بیماری سے، قوم کو صحت عطا ہونے کے لئے تھی۔ ایسی ایک سُنت کو اپنا لو، اپنا غم چھوڑ دو۔ اُمّت کے غم کو اپنا لو تو تمھیں زکوٰۃ میں بہت کچھ ملے گا۔ دعا کو پاک کرنے کے لئے غم ضروری ہے، جیسا امام زین العابدینؑ کو تھا۔ اپنے غم چھوڑ کر غم اُمّت کو اپنایا۔ رحمۃ للعالمین کے عشق نے اپنی اور اپنے اقرباء کی طرف نظر نہ جانے دی بلکہ اُمّت کی ابتلاء کی طرف اس حالت میں بھی رخ لیا۔ اُمّت کی دین و دنیا کی بربادی کیسے دیکھی جاسکتی تھی۔ اُمتی اُمتی اس حالت میں بھی کہا جا رہا تھا۔ رحمۃ للعالمین کے اسی عشق مجلّی نے غم اُمت دیا۔ معراج میں اُمّتی اُمّتی ہوا تو کربلا کے میدان سے بھی یہی سُنت ادا کی گئی۔

صحیح معنوں میں جس کے گلے میں طوق محمدیؐ پڑا ہے وہ حال اور موجودہ کیفیت کو نہیں دیکھتا، بلکہ اُمّت کے لئے جو ہونا

ہے، اس پر اس کی نظر ہوتی ہے، اور ہونا ہے ''کُن''۔اس ''کُن'' کی ابتداء اسی نقطہ سے ہوتی ہے جسے تصور کہتے ہیں۔ ''رحمتٌ للعالمین'' کی اُمّت تباہ و برباد کیسے ہوسکتی ہے۔ارشار باری ہوا تھا کہ میں ان پر عذاب کیسے نازل کرسکتا ہوں جب تم ان کے درمیان ہو۔یہی بات وارثانِ نبیؐ کے لئے ہوتی ہے۔

اندازِ درد

''رحمتٌ للعالمین'' کی اس رحمت کی تائید میں ہر دعا سے پہلے اور آخر میں درودشریف پڑھا جاتا ہے۔ جب پورا درودشریف پڑھتے ہیں تب دعا قبول ہوتی ہے۔اور وہ دُرود بھی کچھ ایسی ادا لئے ہے کہ ہم تیرے محبوبؐ پر درود بھیجنے کے لائق کہاں، اے اللہ تو دُرود اور صلوٰۃ بھیج ان پر اوران کی اولاد اور اصحاب پر۔اَللّٰھُمَّ میں کوئی تیسری شخصیت نہیں ہے۔اپنا نقطہ وجود حق ہے۔ (اے اللہ) اس لئے جب اس ذات گرامی کی طرف رجوع ہوتو اسی نقطہ حقیقت وجود سے رجوع کرو۔محبت کے درمیان، تیسری شخصیت کیسے آسکتی ہے۔اس رنگ میں جب ہو جائے تب مزہ ہے ''صَلِّ عَلٰی'' کہنے کا۔تب لطف آتا ہے۔ کہ صلوٰۃ اور ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی'' کا ایک ہی مخرج ہے۔

یہ قلب کی دنیا ہے جیسے رومال محبوب کا ملاتو اس کی خوشبوؤں میں محبوب میں بس گئے۔محبت سے بڑی عبادت یا دعا کیا سکتی ہے۔عبادت میں معبود اور محبت میں معشوق کا رنگ آجاتا ہے۔اور یہ رنگ کیا تھا ایک درد تھا نبی کریمؐ کو۔اُمتی اُمتی

غوث پاکؒ نے فرمایا صَمَدْ کو راضی کرنے کا طریقہ ہے کہ ٹوٹا ہوا دل لاؤ۔خواجہ اجمیریؒ نے فرمایا کہ اس کے محبوبؐ، اس کے معشوق کو اپناؤ، صَمَدْ خود نیازمند ہو جاتا ہے۔بابا قادرؒ نے فرمایا محبوبؐ کی اُمّت کو اپناؤ، ایک بھوکا پیٹ ہی بھر دو نیاز بے نیاز ہو جائے گی۔ جب تک تم انفرادیت میں ہو وہ فرد میں ملے گا۔اُمّت کی چادر اوڑھ لو۔وہ ہر روپ میں ملے گا۔

قادریہ میں ایک ٹوٹا ہوا دل ہوتا ہے۔ چشتیہ میں ایک دل ہزاروں دل بن کر ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ایسوں کے ساتھ مل کر دعا مانگی جائے قبول ہو جاتی ہے۔

دعا کیا ہے۔ دل خوش کرنا۔کسی کا دل خوش کر دیا، دعا ہوگئی۔اہل خلوص کا دل سے چاہنا، کُن فیکون کی طاقت رکھتا ہے۔

غوث پاکؒ نے کہا دعا حکم ہوتا ہے۔ادباً اسے دعا کہتے ہیں۔حکم دل کی چاہ کے سوا کچھ نہیں۔کس کا حکم ہوتا ہے۔یہ پتا نہیں چلتا۔رب کے نائب بنے ہوئے ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ میری رضا تیری رضا کونسی ہے۔یہ مستی کی شدت ہے۔خود

آگہی کی کیفیت ہے۔حکم جو ہے اس میں خود ہونا پڑتا ہے۔میری رضا، تیری رضا کی دوئی مٹی ہوئی ہوتی ہے۔ یوں رضا اور قضا کے درمیان رہا تو بڑی مشکل میں پڑ جاتا ہے۔اور اگر نبی کریمؐ سے محبت کا ڈورا ہے اور یہ رابطہ ادھر سے ملا ہوا ہے تو پھر یہ بھی حرکت میں آجاتا ہے، اُمّتی اُمّتی کہہ اٹھتا ہے۔

؎ جو ہچکچا کے رہ گیا وہ رہ گیا ادھر
جس نے لگائی ایڑھ وہ خندق کے پار ہے

اسلام کے بچانے کا ذمہ آپ کے ہاتھ ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اصول کی حفاظت کرے گی ذمہ لیا ہے مگر عمل بغیر آپ کے ہاتھوں نہیں۔ ہر سطح پر مرضی الٰہی کے ذریعہ ہی پوری ہوتی ہے۔اس رضا اور قضا کی درمیانی حالت برزخ اس برزخ کی حالت میں ''اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ'' صادق آتا ہے۔اس حالت میں دعا کرنے کے لئے ایسی جگہ جائے جہاں سے آواز بازگشت آئے۔ جیسے بزرگان دین یا مزارات۔قرآن شریف میں بھی آواز بازگشت ہوتا ہے، ان لوگوں کے لئے جن کے دل روشن ہوتے ہیں۔معراج شریف بھی آواز بازگشت تھی۔حقیقت تو ایک ہی ہے۔ یہ اَدْعُوْنِیْ وہی کر رہا ہوتا ہے۔ یہ صدا تو باطن سے نکل رہی ہوتی ہے۔ پاک اور قدوس وہی ہے، بندہ کی کیا مجال۔آئینہ صاف ہو تو بازگشت ہوتی ہے۔

عمل کا میدان

رحمت تمام صفات الٰہی کا جواب ہے، احاطہ کئے ہے ہر چیز کو۔ایک ہاتھ تمھارا ایک اللہ کا، تب کام بنتا ہے۔اپنی روح پھونکی ہے اس لئے تعلق روح اعظم سے ہے۔ روح کا میدان امر کا میدان ہے۔ روح اعظم کی آگہی سے پھیلتا جاتا ہے، جیسے موج۔پھر اپنے کو سمندر دیکھتا ہے۔عمل کا میدان کھل جاتا ہے۔ دنیا کو اس کو نظر سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ یہ سوال کہ برے کیوں پھل پھول رہے ہیں اور اچھے خرابی میں پھنسے ہیں، کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔اس کی نگاہ تو اب ''یُنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہ'' ہے۔ یہ وہ نگاہ ہے جس سے تقدیر بدلتی ہے۔ایسے نے قائم کرو کا انداز اپنا لیا ہوتا ہے، کہ اپنے کو وجود سے نکال کر، اوپر کی سطحوں میں قائم کر لیا ہوتا ہے۔خواہشات جسم وتن کو ختم کر کے اپنے کو لطافتوں میں بسا لیا ہوتا ہے۔یعنی مجردات ذات میں، عین توحید میں۔اب وہ ''قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ'' اٹھ جاؤ اللہ کے نام سے، کہنے میں دوئی دیکھتا ہے۔اس کے لئے ''قُمْ بِاِذْنِیْ'' اٹھ جا میرے حکم، سے عین توحید کی بات ہے۔ کیونکہ جب یقین نہیں ہوتا کہ مردہ زندہ ہو جائے گا تب دعا کرے گا، اللہ کے نام کا واسطہ لائے گا۔ وہ اس عین الیقینی حالت میں ہے کہ زندہ ہوگا اور ضرور ہوگا، شک کی گنجائش نہیں فنا فی الذات کے لئے۔ایسی توحید میں جو چاہا

وہی ہوتا ہے۔اس سطح کی دعا یہی ہے۔ایسے کی ہے،حکم ربّی ہے۔ایسے کی دعا اللہ کا ہاتھ بٹانا ہوتا ہے۔وہ حالت سے متاثر ہو کر،اس کی بہتری اپنی سمجھ کے لحاظ سے سمجھ کر رہا ہوتا ہے اور ایسی نیکیوں میں کہ اللہ ہی تو چاہ رہا ہوتا ہے۔

ایسی ہستی اگر پردہ بھی کر جائے تو اور زیادہ لطافت پیدا ہوتی ہے۔اسی لئے ان کی وساطت سے دعا جلدی قبول ہوتی ہے۔یہاں تک کہ اگر خود کوئی پردہ کر جائے اور عالم برزخ میں مصیبت میں پھنسا ہو تو ایسا ہی وسیلہ یاد آجاتا ہے اور اس مصیبت سے چھوٹ جاتا ہے۔ایسے کے ذریعہ سے بخشش ہو جاتی ہے۔بخشش کے معنی گناہ اپنے اوپر لینا نہیں ہے، بلکہ جیسے کہ بچے کو ماں نظر آجاتی ہے تو تشفی ہو جاتی ہے۔

مگر وجود میں رہتے ہوئے کسی آمر کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ایک تو اُمّتی ہوئے اور دوسرے رحمۃ اللعالمین نسبت، اس لئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنا کیسا۔مرضی الٰہی پر شاکر رہنے کا بہانہ کیا۔دنیا دارالعمل ہے۔فرائض میں کوتاہی کیسی۔ مخلوق کو ان کے حال پر چھوڑا تو خدا کو چھوڑا۔اس لئے **رحمۃ للعالمینی** نسبت کے بھروسے اور ایمان کی شدت میں، ایک عاشق عارف، اذان اور اقامّت کی درمیانی برزخ میں ہو کر صف بندی سے پہلے اُمّت کے لئے دعا کر رہا ہوتا ہے۔جب بھی اس کے قلب و روح میں عشق کے شعلے یا اور کسی شدت سے کوئی طلب یا آرزو اٹھی ہے اور اس نکتہ سے جو بھی لہر یا جنبش پیدا ہوتی ہے اس کا ارتعاش کائنات میں ہوتا ہے۔یہ ہے کُن کا مقام، یہ ایسا ہے کہ ساکن، سمندر۔بحر حقیقت میں کنکری ڈال دی تو پورے سمندر میں اس کا ارتعاش ہوا۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب تجرید حق اسی فرد کے باطن سے باہر نکل رہی ہو۔اس سمندر کا تعلق چونکہ وجود کل سے ہے اس لئے اس کو دہر کا سمندر کہنا ہوگا۔جب اس فرد کو کل کی آگہی آجاتی ہے تو سوچنے پر خیال تو آتا ہے کہ کس کی آگہی آئی۔لے دے کہ اپنی انفرادیت پر نکتہ جمتا ہے۔مگر کُل کُل ہے۔اس لئے اس کیفیت میں ہوتے ہوئے یہ باتیں کہ یہ جسم ہے، یہ جان ہے، یہ زمان ہے، سمجھ میں نہیں آتیں یا اس بات کو یوں سمجھو کہ جہاں کنکری پڑی اس جگہ کو 'انا' کہہ لو، اب دعا وہی مرکز قبول کرتا ہے۔انا، کنکری کیا ہے، ''ب'' کا نکتہ، نکتہ وجود حق، جس میں نہ خواہشات ہیں، نہ تکالیف، نہ خوشیاں۔اسی حالت میں کہیں، یہ وہ نکتہ بن سکتا ہے جو ارتعاش کرنے کا سبب بنتا ہے۔اس طرح مرکز 'انا' اور نکتہ ''ب'' کا ارتعاش ایک ہوا۔حضرت ابن عزلؒ نے فرمایا کہ وہ جو اللہ نے کُن کہا۔وہ اپنے سے کہا۔عشق کے طفیل جب یہ دیکھے اور پالے تو رحمت کا مفہوم ملے۔اپنی 'انا' کا کُن ہی تفریدی انداز سے تجریدی رحمت کا سبب ہوتا ہے۔اسی سطح سے اُمّت کے لئے دعا ہوتی ہے۔رحمت ایک عالمی چیز ہے جسے نور محمدیؐ کہہ لیں، یا حسن کی تجرید۔اور اس کی تفرید اس وقت عالم اسلام میں جو وجود میں

ہیں، ان میں سے کسی میں ہونی چاہیے۔ کیونکہ امر، ان سے ہی صحیح جاری ہوتا ہے جو وجود میں ہیں۔

دعا کا طریقہ ابتدائے تخلیق سے لے کر غالباً حضرت موسیٰ کے زمانہ تک یہ رہا کہ بیل ذبح کر کے پہاڑی پر چھوڑ دیتے۔ اگر آسمانی آگ اتر کر قربانی کو کھا لیتی تو نیاز قبول ہو جاتی۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں یہ صورت ہوگئی کہ معبد میں گائے یا بیل کی قربانی کر دی جاتی۔ رفتہ رفتہ دعا کرنے کے مختلف طریقے رائج جیسی نشانی کی شکل اختیار کر گئے۔ دعا میں ہاتھ اٹھانا ہر قوم، ہر مذہب میں راج ہوا۔ اس دعا میں ہاتھ اٹھانے کے پیچھے کوئی ذہنی، قلبی، روحانی طلب ہی ہوتی ہے جو اندر چھپی ہوتی ہے۔ اور شاید ہاتھ اٹھانے والے کو بھی اس کا یہ شعور نہیں ہوتا۔ آخر ہاتھ اٹھانے میں ایک تسکین سی کیوں مل جاتی ہے۔

مثال کے طور پر جزامی کو لیں۔ اس میں ہاتھ ملانے کا ایک شدت سے جذبہ ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور لوگ بھاگتے ہیں۔ یہ کتنی معنی خیز بات ہے۔ آخر جزامی کا تحت الشعور اسے ایسا کرنے پر کیوں مجبور کرتا ہے۔ اس ہیجانی جذباتی رجحان کے پس پردہ، وہی ذہنی، قلبی، روحانی گہرائیوں کی طلب کارفرما معلوم ہوتی ہے۔ اندازاً یہ تین باتوں کے تحت ہے، یا تو جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، یا پھر روح کا یار سے ملاقات کا شوق، یا شکریہ شانِ وجود۔ اسی طرح دعا میں، بے ساختگی میں، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھ جانا بھی ایک فریاد کا انداز ہے، سہارا مل جانے کی تمنا ہے، یا روح کی یار سے قربت کی تڑپ ہے۔ اپنے ہی دونوں ہاتھ صلوٰۃ میں، ساتھ ساتھ، من و ساقی بہم سازیم کی نشانی۔ گویا یار کا ہاتھ بٹانا ہے، ہاتھ تو آگے بڑھا رہے ہیں ایک اپنا ایک یار کا۔ عجب بے ساختگی کی یکتائی ہے۔ ایسی یکتائی جس میں ساقی کا بھی جسم و جودی نشانی میں آنا تھا۔ ساقی جو غیب میں ہے۔ اس کا بھی ہاتھ آنا تھا۔ یہ ایسی اکائی ہے کہ نہ اپنے ہاتھ کی خبر ہے نہ تیرے کی۔ دونوں ہی اپنے، دونوں ہی تیرے۔

یا پھر دعا میں ہاتھ کچھ اس کیفیت میں اٹھائے جیسے رحمت کے لئے کچھ احساس ہو۔ اعلیٰ اقدار کی طرف قدم ہو، تو بس ہاتھ آگے بڑھنے لگتے ہیں۔ مظلوم انسانیت کے لئے ایک سہارا بن جانے کا انداز ہے۔ شکریہ شانِ وجود اس رنگ میں ہے کہ قدوسیت عالم امکان میں نشر کی جارہی ہے۔ ایک ایریل کی طرح انگلیاں سے عالم امکان پر پھیلی ہوئی ہیں۔ انوار تجلیات، رحمانی رحیمی، "**رحمۃ اللعالمینی**" نشر ہو رہے ہیں۔ بے اختیار عمل کی نشانی میں دونوں ہاتھ اٹھے ہوئے ہیں۔ سیدھا ہاتھ دین، بایاں دنیا۔ دین و دنیا کو توازن میں کئے رجوع الی اللہ۔ میدان عمل کائنات میں کھلا ہوا، زمین سے آسمان تک۔

ان ہاتھوں کے پیچھے، قلب کی ہیجانی، جذباتی کیفیت ہیں۔ روح امر ربی کی تڑپ ہے، مرضِ الٰہی سے ہم آہنگی ہے۔ گویا سب وجود کو ایک روحیدی رخ ملا ہے۔ "اِنِّیْ وَجَّھْتُ" کا انداز ہے۔ آمنا سامنا، حضوری، مگر بے حجابی کی گستاخی کی

مجال کہاں۔ دونوں ہاتھوں سے، آنکھوں کو ادب سے ڈھانکے۔ دعا بھی ہوگئی اور حضور بھی نصیب ہوئی۔

من مورا بھیاتن پتیم کا　　اب شغل میں نُور کپُور بھیو

اس انداز کی دعا مقبولیت لئے ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ بند راستے کھلتے ہیں، قسمت کی آئینہ داری اور رونمائی ہوتی ہے۔ دعا سے نظام کائنات میں فرق نہیں پڑتا۔ جیسے کمپیوٹر میں اگر کوئی غلطی ہوجاتی ہے تو اس کو خود درست کر لیتا ہے۔ اسی طرح کائنات کی مقرر سرکٹ میں ہم دوسری جو اس پر عائد کرتے ہیں، تو خود بخود درستگی اور توازن ہو جاتا ہے اور نظام میں فرق نہیں پڑتا۔ ایسی دعا تو عین رحمت ہوتی ہے۔ رحمت کے سمندر میں ارتعاش لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ جیسے ابر رحمت منڈلا رہے ہوتے ہیں مگر جب تک دعا کے ذریعہ ان کا سینہ شق نہیں ہوتا، بارش نہیں ہوتی۔ خواہ یہ دعا تپتی زمین، یا درختوں کے جھنڈ، یا کسی کے سینے سے نکلی ہو۔ یہ بھی حسن ازلی، رحمت تمامی، کی شان حیاء اور خود پردہ میں رہ کر ایک واسطے، ایک رابطے کو ذریعہ رحمت بتاتے ہیں۔

؎ خود بھیک دیں اور کہیں منگتے کا بھلا ہو

بات یہ بھی تو ہے کہ تجریدی رنگ لیے اس پیکر وجود کے غیب میں بھی خود وہی تو ہیں اور کوئی دوئی بھی نہیں۔ ''فِیْ اَنْفُسِکُمْ'' کا نقشہ جما ہے۔ اسی لئے فرمایا۔ اپنے اندر دیکھو، ہم شہ رگ کے قریب ہیں۔

فقیروں کا کہنا ہے کہ ''عَرَفَ نَفْسَہٗ'' کے معنی جان کی سیر کے ہیں۔ شروع میں ''عَرَفَ نَفْسَہٗ'' اپنا جائزہ لینے تک کی بات ہوتی ہے۔ کہ یہ برائیاں ہیں، یہ خوبیاں ہیں۔ مگر یہ جائزہ تو آپ کی برائیوں یا خوبیوں کا ہوا، ذات کا تو نہ ہوا۔ ''عَرَفَ نَفْسَہٗ'' تو اس وقت ہوا جب جان کی سیر کی، ذات تک پہنچے۔ عشق چور دروازہ ہے، ذات کا۔ فقراء میں بھی سرنگ کا تصور ہے۔ جیسے پاک پتن، سہون شریف، منگھوپیر ہوتے ہیں لاھوت لامکان کی سیر کر آتے ہیں۔ ان ظاہری نشانیوں کے پس پردہ ان ہی چور دروازوں کی بات ہے جن سے ذات تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حضرت عزیز مکیؒ کی بابت مشہور ہے کہ صحابہ میں سے ہیں۔ کئی جگہ ظہور فرما چکے ہیں۔ پھر کئی سو سال بعد کسی اور مقام سے ظہور کر لیتے ہیں۔ آخر بار پاکپتن شریف میں آرام فرما ہیں۔ جہاں مزار ہے تو یہ بھی کچھ سرنگ کی ہی بات ہے۔ رحمت للعالمین تک رسائی کی بات ہے۔

کائناتِ باطن اور چور دروازے

یوں سائنس دان کہتے ہیں کہ ہماری کائنات کے علاوہ ایک بالائی کائنات بھی ہے۔ اپنی کائنات میں ایسے فاصلوں سے

سابقہ ہے جو روشنی کے سالوں میں ہی شمار کئے جاسکتے ہیں۔ بے حدو بے پایاں فاصلے۔لیکن اپنی کائنات سے بالائی کائنات میں روشنی کی رفتار سے تیز رفتار پر سفر کر کے فاصلوں کا شمار ختم ہو جاتا ہے۔ ہماری کائنات اور بالائی کائنات کے درمیان سوراخ ہیں۔ روشنی حد فاصل توڑ کر اس سوراخ میں داخل ہوئے تو اس بالائی کائنات سے آن واحد میں گذر کر اپنی کائنات کے دوسرے حصے میں آنِ واحد میں پہنچ سکیں گے۔ یوں یہ سفر دس روشنی کے سالوں میں بھی طے نہ کر پاتے اور پتہ نہیں کتنی نسلوں میں انسان یہ سفر طے کرتا۔ کائنات گول ہے چپٹے کاغذ کے ایک سرے پر سوراخ ہو اور دوسرا سوراخ دوسرے سرے پر، تو جب یہ کاغذ گھما کر ایک سوراخ دوسرے پر رکھ دیا جائے تو ایک سوراخ میں گذر کر دوسرے میں آنِ واحد میں پہنچا جا سکتا ہے کو چپٹے کاغذ پر یہ فاصل بہت دور لگتا ہے۔ آئن سٹائن کے مطابق روشنی کی رفتار کے قریب رفتار ہو جانے پر کسی خلائی جہاز کی لمبائی صفر ہو جائے گی۔ اس کی کمیت، لامحدود ہو جائے گی۔ اس کو آگے چلانے کے لئے لامحدود طاقت والا انجن درکار ہوگا۔ روشنی کی رفتار تک پہنچتے پہنچتے تمام جہاز میں وقت سست ہونے لگے گا اور روشنی کی رفتار پر وقت ساکت ہو جائے گا۔ اس پر غور کیا جائے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ خلاء کھینچ بڑھ سکتا ہے۔ لا متناہی رفتار پر کمیت لامتناہی ہو جاتی ہے۔ اور اپنے اپنے ماحول کے مطابق کائنات میں وقت کی رفتاریں مختلف ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں وحی کے نزول پر قدم مبارک کے نشانات، معراج میں زمان کا سکڑنا، اور زمین کے وقت کے مقابلہ میں زبردست تیز رفتاری، یا قبر میں زمین کے وقت کے مقابلہ میں سستی وغیرہ بھی ایک قرینِ قیاس بات ہو جاتی ہے۔

بات روزنوں کی ہے۔ ذات تک رسائی کی ہے۔ ان روزنوں میں نہ زمان نہ مکان۔ اس میں ہر واقعہ جو رونما ہوتا ہے، ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور اس میں ہر سفر ایک لمحہ میں طے ہوتا ہے، کیونکہ اس میں داخل ہونے کے بعد زمان مکان کو تو پہلے ہی چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ یہ سوالات تک کہ بالائی کائنات ٹھنڈی ہے یا گرم، تنگ ہے یا کشادہ، مکعب کی شکل ہے یا گیند نما سب بے معنی ہیں، کیونکہ یہ تو وہ جگہ ہے جہاں کوئی جہت نہیں۔ جہاں نہ ماضی ہے، نہ مستقبل۔ اس بالائی خلاء میں یہ سوال کہ آگے کیا ہوتا ہے، بے معنی ہے۔ یہاں پہلے، بعد، آگے، پیچھے بے معنی ہیں۔ لہٰذا وقت کے روزمرہ تخیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو پھر یہ خدا کون ہے یا عقل کل کون ہے جو تمام بالائی کائنات کو صرف ایک ہی نظر میں، آگے پیچھے، ماضی مستقبل میں دیکھ لیتی ہے۔ یہ وہ عقل کل ہے جو ایک لمحہ میں ان تمام قوتوں کو جانتی ہے جو فطرت میں عمل پیرا ہیں۔ یہی عقل کل چیزوں کے نسبتی تعلق کو سمجھتی ہے اور چونکہ اس عقل کل میں تمام قوتوں کے تجزیہ کرنے کی صلاحیت ہے تو پھر ایک ہی جامع فارمولے میں وہ تمام کائنات کے وزنی اجسام اور چھوٹے سے چھوٹے ایٹم اور اجزاء کا کلیہ پیش کر سکتی ہے اور عقل کل کے لئے کوئی چیز غیر متوقع نہ ہو گی۔ اور

ماضی اور مستقبل اس کی نگاہوں کے آگے حال اور حاضر ہو گا۔

اب خیال کریں کہ ایک سگنل روشنی کی رفتار سے خلاء میں سفر کر رہا ہے تو دوسرا سگنل اسی رفتار سے خلاء کے سوارخ میں سے گذار کر اس سے کہیں زیادہ فاصلہ آگے کیا جاسکتا ہے۔ کچھ اس طرح بات دُعا کی آتی ہے۔ جب فاصلے ناممکن معلوم ہوں، راہ نظر نہ آرہی ہو، تو ایسے سوراخ تلاش کرنے ہوتے ہیں۔ جن سے دامن رحمت میں پہنچ ہو سکے۔ مگر ہاں ساتھ ساتھ اپنی دُعا میں وہ شدت بھی آجائے کہ اس کی رفتار، رفتارِ نُوری ہو جائے اور نور کے دھاروں پر سفر ہو رہا ہو۔

یہ چور دروازے، یہ روزن مختلف رنگ میں ہیں۔ لطیفہ نفس کی سطح پر یہ چور دروازہ خلوص و وفا ہے، خدمت خلق ہے، بھوکا پیٹ بھر دیتا ہے۔ قلب کی سطح پر شرح صدر ہے، ٹوٹا ہوا دل ہے، ایثار ہے، قربانی ہے، شہادت ہے۔ روح کی سطح پر محبوبیت کو اپنانا ہے۔ **"رَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ"** ہے۔ رحمتوں کے سائے آنا ہے۔ اَمر ربّی، اَنا دھر، بننا ہے، اور غیب کی سطح پر یہی روزن لاھوت لامکان ہے۔ ان سب منازل کی دعا اپنی اپنی سطح کو کچھ اس طرح چیرتی ہے کہ کہیں۔

آسمان چیر گیا نالۂ دلگیر مرا

ہر سطح پر انسان کی جدوجہد یہی ہوتی ہے کہ نفس سے لے کر قلب، روح، سِر، خفی، اَخفا، غیب تک کی منازل میں ایسے سُوراخ تلاش کرتا جائے جن سے آنِ واحد میں رسائی ہوتی ہے۔ حضوری ہوتی ہے۔ یہ جب ہوا تو دُعا کرنے کی بھی اٹکل مل جائے گی اور سیر، زکوٰۃ میں۔ شرط بس شدت رفتار کی ہے۔ شدت یک رخی ہے، جو عشق و رحمت کے طفیل ہی ہر منزل میں نصیب ہوتی ہے۔ کائنات ارضی جسم سے، کائنات سماوتی باطن میں، اپنے ہی اندر یہ سوراخ، چور دروازے اور سرنگ تلاش کرنے میں اور اپنے ہی اندر یہ فاصلے طے کرنے ہیں۔ ظاہر سے باطن اور باطن سے در باطن ان ہی چور دروازوں سے پہنچنا ہوتا ہے۔ بغیر یار کی مرضی کے یہ ممکن نہیں۔

یہی **"اِلّا بسلطان"** والی بات ہے۔ اجمالی طور پر اپنے اندر اور تفصیل طور پر کائنات عالم میں ہی **ادعونی**، (مجھے پکارو) کا انداز لینا ہے اور نہیں سے **"اَسْتَجِبْ لَکُم"** ہونا ہے۔ یہ وحدت الوجود کی بات ہے۔ اس کیفیت کو وہی جان سکتے ہیں۔ جنہیں یہ بصیرت حاصل ہو کہ نظام فطرت ہوائے نفس پر قائم نہیں ہے۔ بلکہ قدرت کی کارفرمائیوں کا ایک لطافت توحید میں اظہار ہے۔ ایک ترتیب اور توازن میں کاروبارِ عالم چل رہا ہے۔ اور ایک یکتائیت وجود کی رنگا رنگ کارفرمائیاں تخلیق عالم میں جلوہ نما ہیں۔ کائنات برابر ارتقاء میں ہے اور اسی ارتقاء میں اپنا توازن برقرار رکھے ہے۔ وحدت وجود اسی Dynamic

equilibriam محرک توازن میں ہے۔اورالہیت بھی اسی اندازکُن میں ایک محرک توازن میں ہے۔جمودی حالت میں کائنات کی کوئی شے نہیں اور نہ ہی الٰہیت جو "کُلَّ یَوْم ھُوَ فِی شَان" (ہر روز نئی شان) کے انداز میں ہے۔ایک شدت ارتقاء میں ہر شے رجوع الی اللہ ہے۔جیسے کسی رخ بھی دریا بہہ رہا ہو اس کی روانی کی سمت میں فرق نہیں آتا۔اسی طرح عالم امکان میں رنگا رنگ صورتیں اور ان گنت انداز ہیں۔ پھر بھی توازن اور اکائی برقرار ہے۔ اس نشہ وحدت الوجود کا صرف کیف ہی لیا جاسکتا ہے۔اسلام اسی وحدت کا سبق دیتا ہے۔

اسلام نصب العین

اسلام کے حسن باطن کو، اس نصب العین، فروغ کُن کو کسی نے پیش نہیں کیا۔اس کے کہیں کہیں، اشارے اقبالؒ نے دیے یا علامہ یوسف علی کے قرآن کے ترجمے میں اس کا ذکر کیا گیا یا مثنوی مولانا رومؒ میں بہت کچھ یہ رنگ اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔مگر مکمل طور پر اس نکتہ کی وضاحت نہ ہوسکی۔ اسلام کے فروغ باطنی کی لطافت تو اس اچھوٹے انداز میں زندگی گزارنا ہے جیسے کلی چٹک رہی ہو۔ وہ چٹکنے کا کیف، وہ فروغ کی تجلّی جو دائم رہے، یہ نہیں کہ گل بن جائے۔ یہ نصب العین فروغ، یہ نمودی تڑپ، اتنا حقیقی انداز ہے کہ اس میں نہ دھوکہ ہوسکتا ہے نہ مغالطہ۔بس ایک بانکپن ہے لطافتوں میں جینے کا، لطافتوں کے اپنے اظہار کا۔حسن جمعیت کے رنگ میں دائم قیام ہے، ہر روز جمعیت کی نئی آن نئی شان ہے۔اس شان میں زندگی وہ ہے جو موت کی دسترس سے بالاتر ہو، رواں دواں پیہم دواں، ہر دم جوان، چلتی رہے۔یعنی فروغ کُن کا اظہار گروہ انسانیت میں، جمعیت کے فروغ میں نسلاً بعد نسلاً زمانہ دیکھتا رہے۔مسلمان کو اسی فروغ میں حسن کائنات دیکھنا تھا۔اسی میں وہ بصیرت پانی تھی جس میں حقیقت کو ہر فرد کی چشم حق بین دیکھ سکے۔اس چشم بصیرت کا دیکھنا ہی تو سب کچھ ہے۔ جب تک اس آنکھ سے نہ دیکھا تو حقیقت کی کیا بھنک لگ سکتی ہے۔یہ کیف کُن، یہ لطف فروغ، اس وقت تک نہیں آسکتا، جب تک کہ انسان عقل کے پر فریب چکروں اور دوئی کی گرفتاری سے نجات پاکر نگاہ کی پاکی حاصل نہ کر لے۔ یہ حالت اسی وقت ہوسکتی ہے جب زمانی مکان سے جیتے جی رہائی حاصل کر لی جائے "مُوْتُوْ قَبْلَ اَنْتَ مَوْتُوْ" نصیب ہو۔ زمان ومکان سے نکل کر ہی حقیقت کا ادراک ہوسکتا ہے۔ جیسے پانی سے باہر نکل کر پانی کے اندر کا شعور ہوسکتا ہے۔ یوں دیدار بھی جنت کا آخر مقام بتایا گیا ہے۔ البتہ وہ آنکھ جس میں اپنے وجود اپنے جسم و جان سے نکلنے کی صلاحیت نہ ہو وہ کیا دیکھے گی۔عقل کے پر فریب چکروں اور دوئی میں گرفتار رہ کر نگاہ کی پاکی، یکے دیدم، یکے بینم کی بات کی سمجھ پاوے گی۔ یہ صرف عشق کے طفیل ہم دم محبوب میں گم ہو کر

نصیب ہوسکتا ہے۔ اور یہ بھی پہلا قدم ہے کہ حسن کے جلوؤں میں اپنے کو گم کر کے وہ نظارہ دیکھے۔ آخری قدم تو محبوب سے اکائی میں وہ نظر، وہ جلوہ خود بن جاتا ہے۔ یہ ایسی اکائی ہے کہ نظارہ، نظر، اور ناظر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

عشق اور توحید کی گرفت یہ عقل و ذہن نہیں کرسکتے۔ اس کی کیفیت قلب میں اس وقت آسکتی ہے جب یک رخی یکسوئی حاسل کرلیں۔ اسلام میں آئین کی پابندی، اصلاح نفس، مجاہدے، ابتداء سے تھے، عشق کا پرچار غالبًا سب سے پہلے رابعہ بصریؒ نے کھل کر کیا۔ اگر قلب میں ذکر بس گیا ہو، تو پھر کنکری کنکری، پتّے پتّے سے وہی ذکر آتا ہے۔ عشق کی توحید اسی انداز کی ہے اسے سمجھانا مشکل ہے۔

مسلمان کو توحید کا سبق یوں ہی دیا گیا تھا کہ اپنی زندگیوں کے ہر عملی پہلو میں اس توحید پر نظر رہے جو کائنات وجود میں ہے۔ یہ عالم آب وگل وحدت وجود کی شکل میں ہے۔ ایک جمعی انداز میں ہے، جس میں انفرادیت کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ انسان کو بھی اپنی انفرادیت کو، اسی وحدت کائنات کا حقیر جزو سمجھنا اور دیکھنا ہے۔ گویا اس بحر حقیقت کی ایک چھوٹی سی لہر جس کا علیحدہ اپنا کوئی وجود نہیں، صرف ایک انفرادیت ہے جو کل سے ہم آہنگ ہے۔ دراصل دوئی کے پھیر نے دنیا کو نچا رکھا ہے۔ عقل کبھی اس راز کو نہیں پاسکتی۔ وہ اپنے نفس اور جسم کی پابند ہے۔ اپنی میں کو کس طرح مٹا کر بحر وحدت میں اپنے کو ضم کرسکتی ہے۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے۔ جب اس کی نفی ہو جائے اور انسان اپنے کو، ذات محبوبؐ میں فنا ہو کر عشق کی رفعتوں اور مجردات کی لطافتوں میں، کائنات سے یکتائی میں پالے۔

یکتائی کہاں سے آئے جب میں ایک علیحدہ انفرادیت کا حامل اور وہ ایک علیحدہ حقیقت ہے۔ اس وہ کے لفظ کا بھی پردہ چاک کرنا آسان نہیں۔ وہ **قُدّوس** ہے، **قیوم** ہے، **رحمٰن** ہے، **رحیم** ہے۔ اور یہ جسم گندہ، ناپاک، ہے تو ایسی زبردست دوئی جب درمیان ہمیں ہے تو کہاں ناپاک مٹی، اور کہاں قدوسیت۔ کس طرح یہ میں، اس کے ساتھ اپنا، ہو سکے گا، اس لئے توحید کے زبانی اقرار سے کیا فائدہ کیا حاصل۔ جب میں نے اپنا مادّی جسم ہی اپنا وجود سمجھا اور اپنی حقیقتیں نہ دیکھیں، نہ اپنی لطافتوں پر نظر گئی، نہ اپنا آپ پہچان سکا جس کی طرف توجہ دلائی گئی تھی، **"مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ"** تو یہ راز مجھ پر کیسے کشادہ ہوتا کہ یہ روح اَمر ربّی کیا شے ہے۔ یہ عشق کی شدت کیا ہے جو سب کچھ یار کے قدموں پر نثار کر دیتی ہے۔ اور یہ جو طبعی، مادی صلاحیتیں مجھے عطا ہوئیں ہیں وہ کیا ہیں۔ کاش ہم جانتے کہ یہ کتنا بڑا احسان اس مالک حقیقی کا ہے کہ اپنی رحمتیں، اپنی غیبی طاقتیں، ہمارے وجود میں پوشیدہ رکھ دیں۔ مگر ہماری نظر جسم سے اوپر نہ اٹھ سکی، جو تجلیات عشق اور امر ربی کو اپنے میں کارفرما دیکھتے۔

یہ غیریت اور دوئی، جسم ونفس میں گرفتاری، ہماری اپنی خود ساختہ باتیں تھیں۔ ان کو ناپاکیوں سے علیحدہ ہو کر دیکھتے تو

اس جسم میں کثافتوں کے باوجود حسن طلب، حسن حقیقت، عشق و امر کی صورت میں جلوہ گر پاتے، حق نے تو اپنے اور ہمارے درمیان کوئی اس حالت میں بھی نہ چھوڑی۔ وہ **رب العالمین** تھے اس لئے برابر ہماری ربوبیت کرتے رہے۔ نہ ہمارے اعمال سے خفا ہو کر ہوا بند کی، نہ رزق، نہ جان نکالی بلکہ فرمایا "**فِیْ اَنْفُسِکُمْ نَحْنُ اَقْرَبُ. هُوَ مَعَکُمْ**" تا کہ اپنی جہالت سے جو دوری کے پردے ہم نے ڈال رکھے ہیں وہ اٹھ جائیں۔ ہمارے ان کے درمیان سے یہ سب فاصلے، یہ سب حد فاصل دور ہو جائے۔ کوئی غیریت اور دوئی نہ رہے۔ لیکن ہم ہیں کہ انہیں ساتویں آسمان پر بٹھا کر اپنے سے علیحدہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ اگر ہم وحدت کا انداز، کیف وانبساط، شکر و احسان میں اپنا کر اپنے اندر گم ہو کر، اپنے اندر دیکھتے تو حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، کہ حقیقت میں سب کچھ وہی ہے ہم اچھے رہے، برے رہے، لمبی عمر پائی، کم عمر جئے، کیا فرق ہوا۔ نہ اپنی مرضی اور کوششوں سے جی رہے ہیں اور نہ اپنے مقدر کے خود بنانے والے ہیں تو کیوں نہ اپنے مقدر پر شاکر ہو جائیں کہ اللہ شکر کرنے والوں کو زائد دیتا ہے۔ ہم کیوں نہ راضی بہ رضا رہ کر ایک سکون دائمی حاصل کر لیں۔

اگر سب کچھ وہی ہے اور اپنا وجود دھوکہ ہے تو جو کچھ ہو رہا ہے اس کا اپنا کیا ہوا ہے، اور اپنے ہی پر ہے۔ ہم کیوں نہ ایک تماشائی بن کر یہ اپنی زندگی کا تماشہ، اپنے سے جدا ہو کر دیکھیں۔ یہ ہمارے وجود کی بے پناہ قوتیں، اپنی مادی جسمانی زندگی، اپنے نفس کی کارفرمائیاں، پھر قلب کی سطح پر اپنی پوشیدہ شدتیں اور صلاحیتیں اور اس سے اوپر، روح، اَمر ربّی کی بے پناہ قدرتیں، آکر کس کی نشاندہی کر رہی ہیں، کس کی حقیقت سے روشناس کرا رہی ہیں۔ جب ہم نے اپنے اندر ہی نہ جھانکا اور باہر سرگرداں رہے، تو ہر جگہ دوئی اور وہم و گمان کے جالوں میں گرفتار ہو ہو کر، ناکام و نامراد زندگی گذارنے سے کیا حاصل۔

دعا کے لئے شدت

ہم اپنی جسمانی قوتوں کو ہی لیں جن کا ۵ فی صد بھی ہم اپنی زندگیوں میں استعمال نہیں کر پاتے۔ یہ جسمانی سطح پر جو ہمیں طاقتیں نصیب ہوئی ہیں، ان کی بابت سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ہماری غذا، کا ایک جز وشکر میں تبدیل ہوتا ہے اور شکر گلائی کوجن، میں۔ جسم کے مختلف حصوں میں، گلائی کوجن، کی رسد توانائی پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ 'گلائی کوجن' کی ترسیل کا انحصار پینل گلینڈ کے ماسٹر کنٹرول پر منحصر ہے۔ یہ گلینڈ تمام سگنلوں کا ڈائریکٹر ہے۔ یہیں سے احکامات جگر، گردوں، وغیرہ تک سطح بہ سطح پہنچتے ہیں۔ اور 'گلائی کوجن' خارج ہو کر زبردست جسمانی توانائی آجاتی ہے۔ اس جسمانی توانائی کا اندازہ اس سے

لگائیں کہ کبوتر چھوٹا جسم ہونے کے باوجود، لمبے لمبے فاصلوں تک پرواز کر لیتے ہیں۔ ناگہانی اوقات یا اضطرابی ہیجانی کیفیات میں انسان اپنی عام طاقت اور برداشت سے زیادہ کام کر گذرتا ہے۔ہسٹیریا کی مریضہ دورہ کے وقت زنجیریں تک توڑ دیتی ہے اور ہاتھ مار کر مضبوط آدمی تک کو گرا دیتی ہے۔ عام طور پر اسے جن کا کرشمہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ علاج کے ذریعہ ایسی مریضہ ٹھیک ہو جاتی ہے۔ سادھو لوگ ہوا میں اڑ کر دیکھا دیتے ہیں۔ قلاباز اور کرتب دکھانے والے محیرالعقول کرشمے دکھاتے ہیں۔اسے اپنے اندر نفس کی طاقت کہہ لیں، یہ نفس اور لطیفہ نفس کی سطح ہے۔اسی سے ارادے اور عزم کی پختگی ہے۔ جب معمولی نفس کی توانائی کی اتنی طاقت ہے تو اس سے اونچی سطح کی قوتیں بے پناہ کیوں نہ ہوں۔

شدت عشق میں فرہاد پہاڑ کھودنے لگتا ہے۔شدت ایمان میں بے اسلحہ لوگ مضبوط دشمن کی صفوں کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔حضرت علیؓ درخیبر اکھاڑ دیتے ہیں۔ یہ انسان کا کام تو نہ تھا۔حضرت ابراہیمؑ بے خطر آگ میں کود پڑتے ہیں۔ رفعی فقیر شدت ذکر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ میں خنجر سے آنکھ باہر نکال کر پھر واپس رکھ دیتے ہیں۔

اس کے آگے روح امر ربی کا مقام کہ 'میں' اور 'تو' کی توحید میں جو قلوب نے چاہا وہ ہوا۔جسم میں رہتے ہوئے ہی اس کی عمل پزیرائی ہے کیونکہ بالآخر عمل اور کام کا تعلق مادی جسمانی سطح سے ہے۔ یہ دل کی چاہ شدت حکم ہے۔اللہ پر ایمان رکھنے والا اسی شدت عشق میں زندگی گذارتا ہے۔ یہ دل بھی تو امر الٰہی بنا ہوا ہے۔اور جب دل اور خیال میں انتشار ہو، ناامیدی نامرادی، رنج، اضمحلال نے گھیرا ہو یا سستی کاہلی، میں بے کیف زندگی گر رہی ہو یا عیش وعشرت میں پڑ کر نہ اپنی کوئی منزل رہی ہو، نہ کوئی نصب العین تو یہ پینل گلینڈ بھی کام چھوڑ دیتا ہے۔

ایک بچہ پر غور کریں جس کے اندر کوئی انتشار نہیں ہوتا۔ وہ کیسا توحید کلی میں چاق و چوبند اور پھرتیلا ہوتا ہے۔ بے پناہ جسمانی حرکات میں بھی شاداں رہتا ہے۔اور نمود کُن اس میں روزانہ ذہنی اور جسمانی ارتقاء کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

عام انسان کا یہ گلینڈ کسی شدت کے تحت ہی عمل میں آتا ہے۔ جب مقصد اس کے آگے کچھ ہو تو حرکت بھی آتی ہے۔ دعا کے وقت عموماً یکسوئی ہوتی ہے۔اور طلب اور ضرورت کی شدت ہوتی ہے۔اس لئے نفس کے مقام والے کے لئے اس میں جو توانائی آتی ہے وہ جسمانی قوت کی شکل لیتی ہے۔عشق والے کے لئے، قلب کی سطح پر یہ توانا عشق کی یک رخی لیتی ہے۔اس سے محبوب کی خاطر کسی فرد میں زبردست انہماکِ کار کا جذبہ ہوتا ہے۔اور جسم بھی ساز گاری کرتا ہے اس سے خود مقام محبوبیت پر فائز ہو کر سطح پر توانائی آتی ہے۔ یہ عالم امر کی توانائی، مجردات کی شکل لے کر کوئی مادی روپ بھی اختیار کر لیتی ہے۔ یہ اس طرح کہ روح کا تعلق روح اعظم، روح کل سے ہے، اس لئے ماحول تک اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ماحول میں اس کا ردعمل مادی

شکل میں ضرور رونما ہوتا ہے۔اور خلقت کے کام کئے جاتے ہیں۔وہ اس طرح کہ سطح بہ سطح مقام امر سے قلوب پر تجلی پڑتی ہے اور قلوب کی یہ روشنی عقل و ذہن، فہم و ادراک اور مادی جسم، سب پر اثر جاتی ہے۔ جسے کہیں کہ پورا وجود کا وجود اس سے روشن ہو جاتا ہے۔

اس طرح جسم میں ہر سطح کی شدتوں کے عملی اظہار کا ذریعہ یہ پینل گلینڈ ہی ہوسکتا ہے، جسے اوپر کی سطح پر تیسری آنکھ بھی کہا گیا ہے۔ یہ دونوں آنکھوں کی درمیانی جگہ پیشانی میں واقع ہے۔آیہ نور کی تفسیر اس کی سب سے لطیف سطح پر کی جائے تو انسان کو اپنی توحیدکلی پر ایک کیف آمیز سرور حاصل ہوتا ہے۔اللہ نور ہے، آسمانوں اور زمین پر یہی نور برزخ ہے۔اپنی پیشانی کی مشکوٰۃ میں یہی مصباح اور چراغ فانوس میں ہے جسے پینل گلینڈ کہہ لیں۔ یہ نور ہی پینل گلینڈ میں کوکب درّیہ ہے۔جسم کے زیتوں مبارک میں، زمان و مکان، مشرق و مغرب کی حدود سے ماوراء اس کا دائرہ عمل ہے گویا انسانی زندگی ساری کی ساری اسی نور کی تجلی سے ظہور پذیر اور مصروف عمل ہے، جیسے سارا وجود اس آگ سے روشن ہو جائے اور بحر حقیقت کی موج کی طرح، انوار ربانی اور رحمتٌ للعالمینی شان کا اسی میں اظہار ہو رہا ہو۔

موحد کی دعا

اب اگر کوئی فرد اپنی پختگی ایمان سے یہ وحدت حاصل کرلے تو ایسے فرد کی دعا قبول ہوتی ہے۔ایمان پورے مکمل بھروسے کی بات ہے اور اس میں اپنا نفس، عقل، ادراک، قلب، روح سب ہی شامل ہیں۔ایک مثال خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔کسی کا بچہ خناق میں مبتلا تھا۔اور اتنا شدید حملہ کہ ڈاکٹروں نے کہا صرف ایک فی صد امید ہے کہ آپریشن سے بچ جائے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر کے منہ سے یہ نکلا کہ اللہ بھی تو ایک ہے۔ یہ صاحب پہلے سے صاحب ایمان تھے۔ان کا کہنا ہے کہ میں نے اجازت دی اور اندر سے پورا یقین تھا کہ یہی ایک فی صد والی بات کامیابی کی نشانی ہے۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ بیماری کے دوران انہوں نے اتنی بھاگ دوڑ کی جیسے بے پناہ قوت اپنے اندر آگئی ہو۔ پانچ بار ان صاحب کو یہ اطلاع ملی کہ بچہ ختم ہوگیا لیکن یہ کہتے ہیں کہ میرا ایمان متزلزل نہ ہوا۔ایک کیف وسکون اندر رہا۔ اور پورا بھروسہ اور ایمان اپنی جگہ قائم رہا کہ بچہ اچھا ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔اس واقعہ اور اسی قسم کے واقعات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایمان پورے اور مکمل بھروسے کی بات ہے۔اس حالت میں انسان توحیدی انداز میں ہوتا ہے۔اگر کوئی فرد اپنی پختگی ایمان سے یہ وحدت گھوڑی دیر کے لئے بھی حاصل کرلے تو ایسے فرد کی دعا بے مانگے بھی قبول ہوتی ہے۔

حق نے انسان کو اگر زندگی بخشی تو زندہ رہنے کی صورتیں بھی اسی کے اپنے اندر بخشیں۔ضروریات زندگی اور ان کا حاصل کرنا اپنے اندر دیا۔ بیماری اوراس کا علاج اپنے اندر ہی رہا۔ دعا جوضرورت کی طلب ہے، اس کا مداوا بھی اس وجود کے اندر دے دیا۔اور یہ ہی کیا حقیقت کی تلاش کی تڑپ اور خود اپنا رب اپنے ہی اندر، کی بات کہہ دی گئی۔ ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ. نَحْنُ اَقْرَبُ. هُوَ مَعَكُمْ فِیْ اَنْفُسِكُمْ'' کس کس طرح اس طرح رجوع کیا جو حقیقت اپنے اندر ہے۔ عام انسانی زندگی کو دیکھا جائے تو اس کی دعا اور طلب کا تعلق ہوائے نفس سے ہے۔قلب اور روح کی تڑپ اس سے علیحدہ بات ہے۔اس لئے اپنی 'میں' کی مادی ضروریات اور خواہشات کی خاطر دعا کی کچھ ایسی صورت ہوئی کہ جیسے تقدیر میں تبدیلی لانے کے لئے یہ پکار ہے۔ قسم کی کشادگی یا بدقسمتی کو دور کرنے کے لئے یہ ہاتھ اٹھ رہے ہیں۔ دونوں صورتوں میں بحر حقیقت میں ایک تلاطم لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔غور کریں تو ایسا الٹا سیدھا تلاطم جو اپنی خودغرضی کے لئے ہو کتنا بے ربط ہوگا۔اپنے ہی ماحول میں ایک ایسی تبدیلی لانے کی تمنا جو نظام کائنات میں کوئی حقیقت نہ رکھتی ہو، کیا معنی رکھتی ہے۔اس قسم کی خودغرضی کے شجر کی آبیاری تو دوسروں کے خون سے ہوتی ہے، دوسرے کا حصہ اپنے لئے مانگنا، دوسرے کی فکر نہ کرتے ہوئے اپنی فکر اور طلب کو پورا کرنے کی آرزو۔اس کی بنیاد تو ظلم پر ہوئی۔اس لئے قبولیت کیوں ہو۔ رحمت کیوں آئے اور یہ جو بتایا گیا ہے کہ دعا مانگو میں دیتا ہوں یہ تمھاری عزت نفس کی خاطر کہا گیا ہے۔ وگرنہ ہوتا وہی ہے جو مقرر ہے۔تمھیں بھی تو اپنی دعا کرنے سے پہلے اس کا حقدار بننا ہے۔اس توحید کو حاصل کرنا ہے، جس میں تم اور تمھاری طلب اور مرضی حق ایک اکائی میں ہوں۔ اپنے اس وحدت کائنات میں اس وحدت کا ایک حقیر جز و سمجھنے لگو تو شاید اس حقیقت کو پالو۔اس وحدت کائنات کا ظل خود انسان کے اپنے وجود میں ہے اس لئے ضروری ہے کہ غیریت کا خیال تک نہ آئے۔ نہ احساسات میں، نہ طلب میں۔ ہر انسان کو زندگی کی اونچ نیچ کو اسی وحدت میں گذارنا ہے۔اور دعائیں بھی اسی وحدت میں ہوتی ہیں۔ جب تم نے دوئی کے پردے درمیان میں حائل کر لئے ہیں، مانگتے اس سے ہو اور دل ان چیزوں میں ہے جنہیں تم مانگ رہے ہو تو تمھاری طرف رخ کیوں کرے۔ کیوں سنے تمھاری بات۔ایسی خودغرضی کی پکار ایک کوشش لاحاصل ہے۔ جب اپنے ہی اندر انتشار ہو، وہم ہو، گمان ہو، خیال کہیں، زبان کہیں، تو نہ الفاظ ساتھ دیں گے نہ آیات کی تکرار مدد کرے گی۔شروع ہی سے جب دوئی اور شرک کا انداز برتا تو اس غیریت میں دعا کے مستجاب ہونے کا اپنے اندر تک سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب میں اللہ سے دعا کرتا ہوں تو میں اور تو دو ہو گئے۔ غیریت آ گئی۔ یہ بت پرستی کی دوئی کی دعا کیوں قبول ہو گی۔

البتہ اگر دعا کے ذریعہ اس سے رابطہ مضبوط ہو رہا ہے تو ضرور مانگو۔ اسے اپنا بنانے کی کوشش کرو۔اپنے آپ کی تو وہ

سُنتا ہے جو اپنا ہو، اور اپنے سے زیادہ اپنا کون ہو سکتا ہے جسے آپ اپنا کہہ سکیں۔ اس حقیقت کو اپنے ہی اندر پالیں تو کوئی دوئی نہ رہے گی۔ سننے والا بھی تو اپنے ہی اندر موجود ہے۔ دور تو نہیں۔ اس سے کونسی چیز پوشیدہ تھی۔ جس کا اظہار اب دعا میں کیا جا رہا ہے۔ اس لئے دعا کرتے وقت اپنی جہالت اور ظلمت کا پردہ اٹھنا ہے۔ غیریت اور دوری دور ہونی ہے۔ یہ دوئی کی حالت اسی وقت ہوتی ہے جب شدت طلب نہ ہو، تعلق نہ ہو، بھروسہ نہ ہو۔

اور توحید پا جانے کی بات ایسی ہے کہ یہ احساس ہو رہا ہے کہ جان اپنے جسم میں محدود نہیں ہے بلکہ ایک لامتناہی سمندر کی لہر ہے۔ کل میں فرد ہے اور فرد میں کل۔ یہ جو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ایک انفرادیت اپنی علیحدہ رکھتے ہیں، کائنات سے ایک علیحدہ خصوصی چیز ہیں، حقیقت کل سے لاتعلق ہیں، تو یہی تو سب سے بڑی جہالت ہے، وگرنہ بات تو یہ ہے کہ

من نیم واللہ یاران من نیم
سرّ سرم جانِ جانم، من نیم

(میں نہیں ہوں واللہ یارو میں نہیں ہوں۔ بھید کا بھی بھید ہوں۔ جان کی بھی جان ہوں۔ میں نہیں ہوں)

نفس کی سطح انفرادی پر زندگی گزارتے ہوئے ہمارے اندر سوائے نفسا نفسی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہم ایک محدود حد کے اندر، جذبہ خودنمائی کے تحت عمل پیرا رہتے ہیں۔ اس طرح ایک محدود شدت عمل ضرور آجاتی ہے۔ اور اپنے اندر والی محدود توانائیوں کا اظہار کسی نہ کسی صورت میں ہو جاتا ہے۔ لیکن یہی بات جب جمعیت کے انداز میں ہو، تو قومی زندگی میں افراد اور نسلوں کو بھی ایک حیات نفس کی سطح مل جاتی ہے، جس کی حدیں معمولی نہیں ہوتی۔ اسی جمعی انداز میں دیوارِ چین بھی بنائی گئی، تاج محل بھی، بابل کے ستون بھی اور مصر کے احرام بھی۔ اسی جمعی زندگی میں زمینوں کی آبادی بھی ہوئی، شہر بھی ابھرے، فلک بوس عمارتیں بھی بنیں، راکٹ اور مصنوعی سیارے ایجاد ہوئے، چاند کا سفر بھی ہوا۔

مسلمان کو توحید ملت کا بھی سبق دیا گیا تھا۔ وہ زندگی کے اس جمعی پہلو کو چھوڑ کر ضلالت اور خواری کی راہ میں پڑ گئے، حالانکہ یہ قوم تو صاحب امر تھی۔ اب صاحب امر کا تصور ہی اس کے لئے خواب و خیال بن کر رہ گیا ہے۔ مسلمان نے وہ عشق کی منزل بھی چھوڑ دی جس میں ایک فرد کی سطح تک بھی، ایک جذبہ عشق والا، ایسے ایسے کام کر جاتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ عشق وہ جذبہ ہے جس میں شدت عمل آتی ہے۔ اور جتنی رکاوٹیں ہوں، اتنی ہی شدت اپنے اندر آتی ہے۔ عاشق کا سب کچھ محبوب کے لئے ہوتا ہے۔ اس کا جذبہ عشق عالم بن کر پھیلتا ہے۔ لہٰذا عاشق کی دعا فدا ہو جانے کا جذبہ ہے، سر قربان کر دینے کا۔ اسی لئے شدت کی بھی انتہاء ہے۔ مسلمان کو یہی عشق رسولؐ سکھایا گیا تھا، جس کے تحت اس نے فدا ہونا جان لیا تھا،

اور دنیا سے اس کا سیلاب تھمتا نہ تھا۔ وجہ یہ ہے کہ عاشق خودسراپا دعا بن چکا ہوتا ہے۔اس عشق کی منزل تو خود ذات باری سے یکتائی میں کہ اپنی خواہش کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ مرضی الٰہی سے سازگار ہو کر مرضی الٰہی کے نشر کا یہی ذریعہ بنا ہوتا ہے۔ نُورٌ عَلٰی نُورٌ بنا، یہ خود دعا قبول کرنے کی منزل میں ہوتا ہے۔اس نور کو دیکھنا ہو تو اس کی آنکھوں میں جھانکو۔ ان میں سے کون جھانک رہا ہوتا ہے، اس کا محبوب۔اس کے زور بازو، اس کے ید الٰہی کو دیکھو، کون اس کے اندر سے عمل پزیر ہو رہا ہوتا ہے۔ اس کے قلب کو دیکھو، کون اس میں بسا ہوتا ہے۔کس کی بادشاہت ہوتی ہے۔اس کی روح کو دیکھو، کس کا امر بنی ہوتی ہے، کس کا حکم چل رہا ہوتا ہے۔ "لِمَنِ الْمُلْوْکُ الْیَوْم" (آج کے دن کس کی بادشاہت ہے) کا یہی مصداق ہوتا ہے۔پھر بھی ہر عاشق عاجز ہوتا ہے۔ایک ٹوٹا ہوا دل بھی عاجز ہوتا ہے۔ عجز کے معنی مٹانا، صفر کرنا ہے۔ عاجز کے قلب و روح سے بھی جو دعا کی لہریں اٹھ رہی ہوتی ہیں وہ توانائیاں بن کر عالم میں پھیلتی ہیں اور دوسرے قلوب پر بجلی گرا کر ذریعہ رحمت بنتی ہیں۔

عاجزی، انتہائے عبودیت

عاجزی کو انتہائے عبودیت کہا گیا ہے۔ جب اپنی ساری قدرتوں اپنے سارے بھروسے ٹوٹنے کے بعد، یہاں تک کہ دل ٹوٹنے کے بعد، جب ایک لگاؤ ہی رہ گیا تھا، وہ بھی ٹوٹ جائے تب "لا اِلٰہ" ہوا۔ سب طرف سے ٹوٹ پھوٹ کر اپنے میں سمٹ آیا ۔ نہ سہارے کی طلب رہی نہ تمنا۔تو رحمت حق خود جوش میں آتی ہے۔اپنے باطن میں "حَیُّ وَ قَیُّوْم" ہی رہ جاتا ہے۔اسی لئے کہتے ہیں کہ عاجز ہو جانا معمولی بات نہیں۔ یہ انسان کے وجود کے ستر ہزار پردے، یہ بھروسوں، سہاروں، عقل کی ترکیبوں کے ستر ہزار بن جب ٹوٹیں، تب ھی اپنی، 'میں' اپنی 'انا' کا ٹوٹنا مشکل ہے۔ جب یہ اپنی جھوٹی انا بھی ٹوٹ گئی تب کہیں حق کی انا جو اپنا باطن دربان ہے رونما ہوئی ۔ یہ اپنے جسم و جان کی جھوٹی قوت، یہ ذہن رسا، یہ عقل و دانشوری کا گھمنڈ، جو ٹوٹے تب عاجز ہو کر اپنے مالک حقیقی کی سمت لوٹتا ہے۔ جب اپنے اندر سمٹے، اس کی عاجزی میں سوائے اس کے عجز کے اور کوئی ساتھی نہ رہے، سب کچھ فنا ہو جائے۔تب کہیں بقا نصیب ہو اور اپنی بقا تک رسائی ہو، راضی بہ رضائے الٰہی ہو کر شاکر و صابر کا مقام پائے۔

یا ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ستم رسیدہ عاجز کی پکار اپنے ہی اندر کی ان باطنی توانائیوں کو مرتعش کر گئی جو رحمت بن کر اس عاجز کے لئے رحمت کی بارش کا سبب بن جاتی ہیں۔ جیسے اپنے اندر سے بخارات آبی اٹھے، اور بادل بن کر اپنے ہی گرد برس گئے اور بجلی وہاں جا گری جہاں ظلم و عروان تھا، یعنی جیسے ظالم۔اسی روپ کی بجلی قہر الٰہی بن کر ان پر جا گری۔ کہیں ایک لشکر جرار

ان کے مقابل لاکھڑا کیا، کہیں قحط و وبا کی ابتلاء میں ڈال دیا، کہیں کڑک اور بجلی اور زلزلے سے ان کی تباہی ہوئی اور کہیں ابراہیمی کے ہاتھیوں پر ابابیل کا لشکر چڑھ آیا کہ ہاتھیوں اور فوج کو دھنکی ہوئی روئی کی طرح کر ڈالا۔

یہ سب توانائیاں انسانوں کے باطن وجود میں تھیں۔شدت جذبات یا شدت عاجزی میں ایک توحیدی انداز فکر جمعیت میں آیا۔ خانہ کعبہ کی تقدیس، خانہ کعبہ والے خدا کی تقدیس اور کعبہ کے محافظوں کی تقدیس ، ایک ہی وحدت میں آئی۔ ایمان نے شدت پکڑی کہ کعبہ مٹ نہیں سکتا۔اپنے اندر کے جذبات اور عاجزی نے ایک ہی انداز شدت لیا۔ان توانائیوں کے اظہار کی مادی صورت بھی لازماً آنی تھی کیوں کہ مادی وجودوں،لشکر ابرہہ پر اس کا اِطلاق ہونا تھا۔ابابیلوں کا لشکر وجود میں آیا۔ چونکہ انسان وجود میں ہے اس لئے اس کی اپنی توانائیوں کو بھی کوئی جسمانی روپ ملنا تھا۔ان ہی پوشیدہ توانائیوں کے روپ فرشتے، شہدا اور اجنا ہیں، جن کے ذریعہ لشکر اسلام کو یہ امداد غیبی ملتی رہی۔ یہ غیبی امدادیں اپنے ہی اندر سے نکلتی ہیں۔قوم میں اپنے جوش ایمان سے مثبت انداز آیا جو اللہ کے نام پر لڑنے میں آنا چاہیے تھا تو اس جذبہ خود اعتمادی، جذبہ ایثار میں یہ اپنی باطنی توانائیاں ، یہ لطافتیں ، یہ مجردات ایک وجودی شکل ضرور لیتے ہیں۔ چونکہ ان توانائیوں کا ہم سے تعلق تھا اس لئے ہمارے ذریعہ یہ شان عساکر اسلام کفّار پر رُعب بن کر چھائی۔کفّاروں کو مسلمانوں کی جماعت کا یہ عزم، یہ حوصلہ، یہ ایمان، ایک مادی ثبوت کے طور پر ایک جم غفیر کی صورت میں نظر آیا۔

مرضی الٰہی کا انشراح

یہی بات ذات الٰہی کی ہے کہ اپنے اندر ذات سے نسبت ہو جائے،تو الٰہی صفات کا اظہار وجودی پیرائے میں ہمارے وجودوں سے ہونا لابدی سا امر ہے۔مرضی الٰہی کے انشراح کے لئے یہی وجودی پہلو ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ تا کہ مادی اور اجسامی دنیا میں جسم کی شکل میں ہی انوار الٰہی کی تابانی ہو۔اور کوئی دوری یا دوئی خالق اور مخلوق میں نہ رہے۔توحید تخلیق کا کچھ یہی انداز ہے کہ نفس، قلب، روح، مادہ ،جسم،توانائیاں، مجردات ، لطافتیں، سب ایک ہی وحدت کو پانے کے لئے یہ جاننا ہے کہ ہم صفات الٰہی میں الجھے رہے تو ذات سے فصل ہوتا جائے گا۔ جب ذات جز و بدن ہو جائے تب کہیں غیریت ختم ہو تی ہے۔ اس لئے جب تک دوئی کا تخیل رہے گا نہ قلب مطمئنہ حاصل ہوگا، نہ فصل دور ہوگا۔ یوں چاہے اکائی اور اللہ ایک یا توحید کا جتنا سوچو یا زبان سے کہتے رہو بات نہ بنے گی۔پھر جب وحدت الوجود میں آگئے تو اپنے لئے دعا کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔ اس حالت میں ہاتھ اٹھانا بھی غیریت بن جاتا ہے۔گو عجز کے اظہار کا اس ہاتھ اٹھانے سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہیں ہے۔

کیسا پیارا تعلق ہے کہ دعا کے ذریعہ ہماری عزت نفس برقرار رکھی گئی ہے۔ وگرنہ ہوتا وہی ہے جو اس کی مرضی۔ اس لئے کہا ہے۔

گر تجھ کو ہے یقین اجابت، دعا نہ مانگ
یعنی بغیر اِک دِل بے مدعانہ مانگ

شاکرو صابر کی دعا

اب تم اگر شاکر اور صابر ہو تو دعا یا طلب مُنہ سے یا دل سے بھی کہنا ناشکری ہے۔ جو ہے اس کا شکر کرو تو رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ ارشاد ہے جو شکر کرتے ہیں ان کو زیادہ دیتا ہوں۔ یہ شکر کر کے دیکھو عجب نسخہ ہے۔ پتہ نہیں بزرگوں نے کیوں نہیں بتایا۔ مگر ہے یہ ایک مرد کا کام۔ کہ کسی حالت مین ہاتھ نہ اٹھے اپنے لئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''جب میں انسان پر انعام کرتا ہوں تو وہ کروٹ بدل لیتا اور جب اسے پکڑ لیتا ہوں تو لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے۔''

یہ لمبے لمبے ہاتھ اٹھانا بھی فطری جذبہ ہے۔ ارتقاء انسانی میں ذہن کی ترقی میں ہاتھ کے استعمال سے ہی ذہن بڑھا۔ اور طبی اعتبار سے خاص رگوں کا خاتمہ انگلیوں میں ہے۔ اسی لئے ہاتھ سے کام کر کے ارتقائے انسانی ہوا ہے۔ قوّت حس، اتنی لطیف چیز ہے کہ اندھے تک انگلیوں کے ذریعہ سے رنگ پہچان لیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو زندگی کے اجرا میں انسان ہاتھوں ہی کا ممنون ہے اور نفسیاتی لحاظ سے اسی ممنونیت میں ہاتھ دعا کے لئے اٹھتے ہیں۔ یا کسی تکلیف میں اور بے قراری میں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھتے ہیں تو نفسیاتی لحاظ سے یہ بھی صحت کی ممنونیت میں ہوتا ہے۔ اور جو صبر کرے۔ یہ تو مجبوری کا نام صبر ہوا۔ لیکن جب ایسی حالت ہو کہ تکلیف ہو اور شعور بھی نہ ہو تب ہے صابر۔ تب ہے صحیح معنوں میں ممنون، دعا کی عملی صورت یہی ممنون ہونا ہے۔ اپنی تکلیف میں، اپنی حاجت سے ماوراء ہو جائے، صرف محبوبؐ رہ جائے تب کہیں دعا ہے۔ جیسے قصیدہ بردہ شریف یا نعت امام زین العابدینؓ۔ کیونکہ ایسی حالت میں دعا صرف درود شریف اور نعت رسولؐ ہے۔ یہ ہی منتہا ہے، انفرادی دعا کی۔ نہ اس کے آگے کچھ، نہ پیچھے، ایک صابر کے لئے۔

جس نعت پر مہر لگ گئی ہے ''**بلغ العلی**'' یہ ایک برزخ ہے اور رابطہ ہے صفات اور ذات کے درمیان، درود تاج تقریباً ''**سورۂ رحمٰن**'' جیسا ہے اور اسم ذات جو ہے اسی درود شریف ہے، وحدت میں نور محمدیؐ کی تجلی میں۔ یوں جو صفات میں الجھے رہیں ان کے لئے الفاظ ہیں نعت کے اور جنہوں نے مشکیں زلفوں میں سر چھپا لیا ان میں سے یٰسین کی خوشبو مہک اٹھتی ہے۔ ان کے لئے نہ کہنا ہے نہ سننا ہے۔ با آواز پڑھیں یا خاموشی سے پڑھیں، اپنے آپ کو ہی سناتے ہیں کیونکہ ظاہر پر فرض

ہے کہ باطن کا ادب کرے۔اور ظاہر و باطن کی کوئی دوئی بھی نہیں۔

جمعی دعا کا انداز

اسلام کا احسان ہے کہ جمعی انداز میں دعا کرنے کا طریقہ بتایا، تا کہ اس انفرادیت کے شرک سے بچیں کہ ہم ہیں۔اپنے ظاہری وجود کو ایک علیحدہ چیز جان کر، خود کو بحر حقیقت سے جدا سمجھ کر شرک کرتے رہتے ہیں۔پھر شاکی ہوتے ہیں کہ دعا قبول نہیں ہو رہی۔ ارشاد باری ہے کافر کی دعا سوائے ضلالت اور گمراہی کے کچھ نہیں، اس دوئی میں ہم وحدت سے اور دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔مگر جب ہم اپنی نانفرادیت کو جمعیت میں گم کر کے اجتماعی حیثیت، عالمی حیثیت میں آجاتے ہیں تو ہمارے لئے مکان زمان ایک ہی توحید ذاتی میں ہو جاتے ہیں۔اب ایسی جماعت کی دعا، جمعی انداز میں وحدت سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔اور اس کی توانائیوں کی قوت کے اثرات کو تائید غیبی کہا جاسکتا ہے۔ایسی دعا بنیاد وجود سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور عین فطرت سے سازگار ہوتی ہے۔ یہ اثرات جمعیت کے اندر ہی اثر پذیر ہوتے ہیں وگرنہ ہماری امداد کو نہ آسمان سے فرشتے اترتے ہیں نہ قبروں سے شہداء اٹھتے ہیں۔ یہ زندہ حقیقتیں ہمارے اپنے وجود کے اندر ہی ہوتی ہیں۔ یہ اندر باہر کا لفظ بھی بے معنی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ان زندہ حقیقتوں اور ہماری اپنی حقیقت کے درمیان کوئی دوئی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایک ہی بحر حقیقت کی موج ہم بھی ہیں۔ بحر حقیقت میں جمعی انداز میں تلاطم یا ارتعاش لایا جاسکتا ہے، جیسے ایک کنکری ساکن پانی میں لہریں بنانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ احسان ہے کہ جمعی انداز میں اپنے نفس، اپنی ذاتی خواہشات کے حجابات حائل نہیں ہوتے۔اپنی غرض، اپنے نفع نقصان کے وسوسوں سے راہ کھوٹی نہیں ہوتی۔اس لئے جمعی انداز میں 'میں' اور 'تو' کی دوئی کا پردہ ہٹ کر، اپنے اندر والی غیبی طاقتوں کے اظہار کی صورت بن جاتی ہے۔ جمعیت کی برکت یہ بھی ہے کہ جمعیت کے لئے جو بھی دعا ہوگی وہ جذبہ ہمدردی، خلوص، اور اخوت کے رنگ میں ہوگی اس لئے باطن میں بھی مقبولیت سے زیادہ قریب ہوگی۔

اسی خلوص سے یا پھر جیسا ذکر ہو چکا عجز سے ہی بحر رحمت میں تلاطم لایا جاسکتا ہے۔مخلص یا عاجز کی ہی اللہ سُنتا ہے۔ خلوص یا عجز کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ رحمت لانے کا نہیں ہوسکتا۔ یہ درود و وظائف پڑھنا پڑھانا صرف اسی صورت میں کچھ اثر کر سکتے ہیں جب خلوص یا عاجزی کا رنگ رکھتے ہوں۔اور اپنے لئے کبھی خلوص یوں نہیں ہوسکتا کہ اس میں خودغرضی خودطلبی لگی ہوتی ہے۔خلوص صرف دوسرے کے لئے ہوتا ہے۔احسان ہے کہ مسلمان کو جمعیت کی زندگی میں زندگی گذارنے کا سبق ملا ہے۔نفس اور لطیفہ نفس کی سطح پر اجتماعی زندگی اور حقوق العباد ہیں۔قلب کی سطح پر جذبہ عشق رسولؐ اسلام ہے جو پوشیدہ صلاحیتوں

کو ابھارتا ہے۔اپنی توانائیوں کو شدت عمل میں بروئے کار لاتا ہے اور روح کی سطح امر ربی ہے جو اسے ملا ہے۔

اپنی توحید کو پا کر جب ذات کو سمو کر، خدائی میں اپنے کو لپیٹا تو اس خدا کے انعام و کرام کا دوسرا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ کام آمران حق کا ہے۔ جو ''اَنَاذَھَرَ اَنا'' ''اَنَااُمّتی'' کی کیفیّت میں زندگی گذار رہے ہوتے ہیں۔ اُمّت کے پینل گلینڈ یہی ہیں۔ان کے باطن وجود سے اٹھی ہوئی لہریں بحر حقیقت میں ارتعاش لاتی ہیں۔ یہ کوئی اپنے سے باہر کی بات نہیں، نہ اپنے اختیار اور عقل کی بات ہے۔عقل تو اس تمام گتھی کو سلجھانے سے عاجز ہے۔ یہ نور تو آمر کو ودیعت ہوا ہے۔ یہ اُمّتی رابطہ وسیلہ ہے، ''رحمۃً للعالمینی'' شان کا اظہار ہے۔اسے خود رحمت عالم کے رنگ میں رنگ کر عالم انسانیت کا کام کرنا ہے۔اس طرح کہ یہی خلیفۃ اللہ کا مقام ہے، یہی سلطان النصیر کا حامل ہے، اور اِلاَّ بِسُلطَان کی صفت کا مظہر۔اسی حقیقت کے بیان کی وہ بات تھی جو جنگ حنین کے موقع پر فرمایا کہ یہ مٹی تم نے نہیں پھینکی ، ہم نے پھینکی ہے۔ گویا وجود اپنا، امر اس کا، انوار اس کے، وحدت الوجود میں یہ امر ساری سطحات نفس، قلب، روح پر چل رہا ہے۔یعنی جسمانی، ذہنی، اخلاقی، روحانی سطحوں پر اور ایک ہی اکائی میں۔اس وحدت الوجود کو بیان کرنا ممکن نہیں، ایک کیف ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

توحید کے اس انداز میں دعا بھی اجتماعی اور عالمی حیثیت سے ہی، یعنی وحدت وجود میں ہی اثر پذیر ہو سکتی ہے۔ یہ ایسی اکائی ہے جس میں زمان مکان دونوں شامل ہیں اور یہ دعا ایسے اثرات رکھے گی جسے جمعیت کے لئے امداد غیبی کہیں۔اس دعا کا وجودی اثر یہ ہوگا کہ اس امر کے تحت ذہن اور قلوب اثر پذیر ہو کر، یک رخی اور توحید فکر میں آجاتے ہیں یعنی ایک ہوا سی چلتی ہے جو سب کو ایک ہی کیف میں لے آتی ہے۔اس قسم کی دعا کے لئے نہ الفاظ کی ضرورت ہے، نہ درود و وظائف کی۔ یہ تو قلوب مومنین ہی میں ایک روشنی سی ڈال دینے کی بات ہے۔ جیسے ایک چنگاری سی سب میں لگا دیتی ہے۔پھر ان ہی میں سے انوار بھڑک اٹھتے ہیں اور ان ہی سے یہ انوار عجب، عجب اعمال کی صورت میں رونما ہوتے ہیں۔ پھر ان خواص کے ذریعہ وہ جمعیت ظہور میں آجاتی ہے، جس کے افراد کی مادی یا باطنی صلاحیتیں بروئے کار ہو کر مشیت کے دست و بازو بن جاتے ہیں۔اس کی مادی مثال ایسی ہے کہ جیسے آتش بازی کا انار ہو، اس کے اندر آتش گیر مادہ ہوتا ہے اور مختلف دھاتوں کے ذرات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے جاتے ہیں۔ یہی کچھ شفقت شیخ کا انداز ہے کہ چند قلوب منتخب کر کے عشق ملت ان مین بھر دیا جاتا ہے اور جب سب کچھ تیار ہوتا ہے تو ایک بتی لگانے کی ضرورت ہوتی ہے یہ بتی لگانے والا ہاتھ قطب عالم ہوتا ہے۔آگ لگانے میں اس کے اپنے ارادے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ''نورٌعلی نورٌ'' کی بات ہے۔اسی لئے اچھے اچھے فقراء اولیاء بے بس ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ آرڈر غار حرا سے چلتے ہیں۔ یا پھر اس مرکز باطن سے کوئی لہر اٹھ کر وہی کام کرتی ہے جو ایک کنکری ایک ساکن

سمندر میں۔ یہ آگ لگانے والا ہاتھ اس وقت عمل پیرا ہوتا ہے جب کوئی نازل وقت خلقت یا اُمّت محمدیہؐ پر آئے اور جیسے کہ انار میں چنگاری لگنے سے آتش گیر مادہ آغ پکڑ لیتا ہے اور مختلف دھاتوں سے رنگا رنگ پھولوں کی چاروں طرف بارش ہونے لگتی ہے، اسی طرح جمعیت کے قلوب میں "تَنَزَّلُ الْمَلَآئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا" جیسا انداز آنے لگتا ہے۔ یہ "تنزل ملائک" اور روح اپنے ہی اندر کی باتیں ہیں بلکہ اندر باہر کی تفریق اس کیفیت توحید میں بے معنی ہے۔ اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ بس ایک ہی اکائی ہے، یا 'ہے' کی واردات ہے۔ اب پچاس یا سوا نار رکھ دیجئے تو ایک ہی پر پڑی ہوئی بتی اس انار کو آتش بار کرتی ہے۔ اور پھر اسی سے سارے انار آتش بار ہو کر جگمگا اٹھتے ہیں۔ وہ ہوتے ہیں جو سدا سہاگن ہوں، بہار ہی بہار، ہلدی میں رنگے ہوئے۔ یہی لوگ انا دھر کے کیف اور "اَنَا اُمّتی" کے مقام پر ہوتے ہیں۔ نہ ان کے ڈھونڈنے کی ضرورت ہے نہ تلاش کی کیونکہ کسی کی ذاتی اغراض پورے ہونے کا ان کے ذریعہ امکان ہی نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے غوث اعظمؒ نے فرمایا یا فقیر وہ نہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو بلکہ یہ کہ "کُن" کہے تو ہو جائے۔ اس مقام کی دعا لوح محفوظ کی تحریر سے علیحدہ کی بات ہے۔ جو آمر وقت ہوتا ہے۔ اس کے نسلی خون، DNA جین میں کسی کی نظر یا تصرّف سے تبدیلی آچکی ہوتی ہے۔ یہ "انا اُمّتی" رنگ میں توحید حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ اس لئے ساری اُمّت کی قسمت اس کے ذریعہ بدل جاتی ہے۔ اس کا لائحہ عمل کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے کہ مقناطیس لوہے کے ذرّات کو ترتیب دے دیتا ہے۔ اس طرح کائنات میں توازن بھی برقرار رہتا ہے اور واقعات کا رخ بھی پھر جاتا ہے۔ یہ دل سے چاہنے کی بات ہے۔ باطنی توانائیاں اور شدتیں، لطافتوں اور مجردات کی صورتوں میں ظہور پذیر ہونے لگتی ہیں۔ اور مادی پہلوؤں میں ان کا اظہار کچھ لا ابدی سا ہو جاتا ہے۔ یہ دل کی چاہ، ارادے کی پختگی، عزم اور ایمان کی بات ہے۔ جب ایک جماعت کے باطن میں اضطراب، یہ ہیجان، یک رخی اختیار کر لے تو اس کی وجودی شکل کسی نہ کسی مادی انداز میں رونما ہوگی۔ اور قدرت کے نظام توازن میں کوئی فرق بھی نہ آئے گا۔

دعا کی مقبولیت کی صورتیں

قصہ مختصر، دعا کی مقبولیت کی صورتیں یہ ہوئیں کہ مخلص یا عاجز، راضی بہ رضا ہو کر ایک توحیدی کیفیت میں ہوتا ہے۔ مرکز وجود ہو کر اس کے قلب سے جو لہریں اٹھ رہی ہوتی ہیں وہ توانائیاں اس کے اپنے اندر اور اپنے اردگرد کے ماحول کو متاثر کئے بغیر رہ نہیں سکتیں کیونکہ ایک توحیدی انداز انہیں نصیب ہے۔ یہ دعائیں اپنے خلوص، تقویٰ اور عجز کی نسبت سے قبولیت کی وجودی صورت لے کر ذریعہ رحمت بن جاتی ہیں اور جو شدت اس مخلص عاجز کے اپنے اندر ہے اس کی نسبت سے اثر پذیر عالم

ہوتی ہے۔

دوسری سطح عاشق کی دعا ہے۔ عاشق خود دعا بن کر کارزارِ عمل میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ عاشق عاجز ہوتا ہے۔ وہ ایسی باطنی شدّتوں میں ہوتا ہے کہ اس کے لئے ناممکن کے کوئی معنی نہیں۔ یہ مومن کی دعا ہوئی۔ اسی توحید کی یک رخی میں وہ ماحول کو متاثر کرتا ہے، کائنات اس کی ہم ساز و دم ساز ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ہی رنگ میں ماحول کو رنگتی چلی جاتی ہے۔

تیسری سطح آمر کی دعا ہے۔ آمر خود مُراد بن کر عالم میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس نے عجز اور عبودیت کی چادر اوڑھ رکھی ہوتی ہے۔ اسی لئے حق کے نشر کا یہی ذریعہ بنتا ہے۔ یہ محبوبیت کی دعا ہوگئی۔ اندر بھی محبوبیت ہے باہر بھی۔ نہ نفس کی خودغرضیاں ہیں نہ عشق کا اضطرار، ایک سکون دائم حاصل ہے، جیسا کہ ساکن سمندر۔ اندر باہر ایک ہی کیف ہے۔ اس سکون میں ایک معمولی ارتعاش بھی ساری سطح سمندر کو مرتعش کر دیتا ہے۔ اس مقام کی دعا کی مقبولیت سے پہلے ہی ماحول میں مقبولیت ہے۔ اسی لئے تاریخ کا رخ بدل جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بغیر وجودوں کے اس عالم امکان میں کام نہیں بنتا۔ رخ دے کر کسی جماعت میں توحید خیال اور پھر اس پر عمل پیرا ہوئے بغیر راستہ نہیں کھلتا۔ یہ اس لئے کہ اللہ کی مرضی کو وجودوں کے ذریعہ ہی عمل پیرا ہونا ہے۔ اور تخلیق کائنات اسی وجودی پیرائے میں ہوئی ہے۔

اسلام کا اب یہی دور کچھ اوپر کی سطح سے چلا ہے۔ اسلام کا یہ نازک دور ہے۔ عالم اسلام میں ہیجان ہے، آمر کے نکتہ باطن وجود سے ایک لہر اٹھ کر موج بحر بن کر پھیل رہی ہے۔ ایک ہوا سی چل رہی ہے جو زمانے کی تاریخ کا رخ جلد ہی بدل دے گی۔ اس طرح تاریخ انسانی اپنی شاہراہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پر گامزن ہوگی۔

الغرض تمام دعاؤں کی بات شدتوں کی ہے۔ یوں سمجھیں کہ جب کبھی اپنے باطن میں کسی نازک وقت میں شدتیں کسی طرح آتی ہیں تو اس حالت میں دعا کے ساتھ اپنے باطن کی بے پناہ قوتیں عمل پیرا ہونے لگتی ہیں۔ قبول کرنے والا اپنے سے دور نہیں۔ اس کے اور ہمارے درمیان برزخ وجودی، وہی تیسری آنکھ، پینل گلینڈ ہے جو نفس، قلب، روح میں ارتعاش لاتا ہے۔ اور شدتیں عطا کرتا ہے۔ ان شدتوں کی وجودی شکلیں مختلف پیرائیوں میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ کبھی اپنے وجود تک ہی ان کا تعلق رہتا ہے، اور کبھی ماحول اور زمانے تک کو اثر انداز کر جاتی ہیں۔ جیسی شدّت ویسا مقام ہوتا ہے۔ ان ظہور کی شکلوں کی بھی انتہا نہیں۔ جو جو طریقے بھی دعا کی مقبولیت کے انسانی فہم میں آسکتے ہیں ان سے بھی بالاتر باتیں ظہور میں آتی ہیں کیونکہ اس بحر وحدت میں اسی حق کی عمل پیرائی ہے جو ہمارے وہم، خیال، گمان سے بالاتر ہے۔ البتہ دعا کی مقبولیت کا ظہور وجودی صورت

میں ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں وجود، دعا کی مقبولیت ایک ہی توحید میں ہیں۔اور کائنات کے توازن میں بھی اس نئی ترتیب سے کوئی فرق نہیں آتا "اَلآن کَمَا کَانَ" (حق تو جیسا تھا، ویسا ہی ہے ظہور کے بعد بھی) تو دعا اور مقبولیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بشرطیکہ دعا کا مستحق ہو، دعا بے لوث ہو، خلوص کے ساتھ ہو، عشق کی شدتوں میں ہو، آمر کے مقام سے ہو، عجز کے پیرایہ میں ہو، نکتہ باطن وجود اور عبودیت کے مقام سے ہو۔ پھر جو چاہا ہو ہوا۔ ایک عبد عاجز کے سجدہ سے کائنات میں ارتعاش آیا۔ لہٰذا "اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُم" (مجھے پکارو قبول کرونگا) کا یہ مقام تو ہو کہ دینے والا بھی اس مانگے پر فدا ہو جائے اور سب کچھ ہی دے دے۔

اَللّٰھُمَّ مَا مَنَنْتَ بِہٖ عَلَیَّ فَاَتْمِمْہُ

اے اللہ تو نے جو احسان مجھ پر کیا ہے، اس کو کامل کر

وَمَا اَنْعَمْتَ بِہٖ عَلَیَّ وَلَا تَسْلِبْہُ

اور جو انعام تو نے مجھ پر کیا ہے، اس کو سلب نہ کر

مَا سَتَرْتَہٗ فَلَا تَھْتِکْہُ

اور جو پردہ ڈھانپا، اس کا اظہار نہ کر

وَمَا عَلِمْتَہٗ فَاغْفِرْہُ

میرے متعلق جو تیرے علم میں ہے، پس اس کو بخش دے۔

(غوث پاکؒ کی دعا)

❁❁❁❁